سہ ماہی برقی مجلہ
ارمغانِ ابتسام
جنوری ۲۰۱۵ء تا مارچ ۲۰۱۵ء
مدیر
امسین محمود

اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلہ
ارمغانِ ابتسام
جنوری ۲۰۱۵ء تا مارچ ۲۰۱۵ء
مُدیر
امین محمود
مشاورت
نوید ظفر کیانی
روبینہ شاہین
ارمغانِ ابتسام
https://www.facebook.com/groups/837838569567305/

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بعض
اوقات اپنے صحابہ سے ہنسی مذاق بھی فرمایا
کرتے تھے، مگر مذاق میں بھی آپ علیہ
السلام کی زبان مبارک سے حق بات ہی
نکلتی تھی۔
(زاد المعاد، فصل فی الفطرۃ و توابعہا، المزاح، ۱/۱۵۴)

کیا کیا کہاں کہاں

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

شرگوشیاں

کسی انگریزی مزاح نگار نے ایک مرتبہ خالص مزاح کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے''۔ اِس ضمن میں اُردو ادب میں بہت سی گونا گوں روایات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تضحیک، تمسخر، تعصب، سطحی لطیفہ گوئی اور سوقیانہ پن سے بھرپور طنز و مزاح کے نمونے بھی ملتے ہیں اور فکری و فنی خوبیوں سے مزین اور ابتذال اور پھکڑ پن سے مبرا ظرافت کی مثالیں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

دنیا کی ہر زبان کے ادب نے منطقی ارتقاء کی ایک طویل مسافت طے کی ہے، تب کہیں جا کر وہ اِس قابل ہوا ہے کہ اپنے معاشرے اور عہد کی ترجمانی کے منصب سے سرخرو ہو سکے۔ اُردو ادب بھی اِس سے بالاتر نہیں۔ اُردو کے دامن پر بھی کئی ایسی صدیوں کی گرد بیٹھی ہوئی ہے جس نے اِسے نکھار کر اِس قابل بنایا ہے کہ عالمی ادب کے سامنے اس کا کچھ منہ سر دکھائی دے رہا ہے، تاہم اگر اب بھی ہمارے ادب کا مزاج مروجہ عقائد اور اخلاقیات سے ممیّز کھا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارا ادب بھی اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے عہد کی نمائندگی کرے بلکہ اِس باب میں جدتوں کی آماجگاہ بھی بن سکے۔ خصوصاً اُردو طنز و مزاح میں لطافت، طنز، مزاح اور بیساختگی میں اگر شائستگی کی آمیزش نہیں تو پھر اس کے مستقبل پر بہت سی انگلیاں اُٹھ سکتی ہیں۔

ہمارے تھیٹر کا اخلاقی معیار اگرچہ خاصا قابلِ اعتراض رہا ہے اور اس میں استعمال ہونے والے بازاری زبان اور لچر بازیوں نے اسے اُس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ ہمارا معاشرہ اس سے قطع تعلق کرتا دکھائی دیتا ہے تاہم ہمارے الیکٹرانک میڈیا نے اِس کی کمی کو کافی حد تک پورا کر دیا ہے۔ خصوصاً ہمارے سرکاری ٹیلیویژن نے اُردو مزاح میں خاصی جاندار اور معیاری مثالیں قائم کی ہیں، اور پچھلے کچھ برسوں سے یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ ایک ایسا میڈیا ہے جسے ''فیملی چینل'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی اسے خاندان کے مختلف افراد مل بیٹھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ تاہم پچھلے چند ایک برسوں سے اس کے کامیڈی ڈراموں کا جو معیار نظر آ رہا ہے اس سے اس کا یہ دعویٰ قطعاً باطل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

غالبؔ کے ایک مصرع سے اخذ کردہ ایک مزاحیہ کھیل ''اگر اعتبار ہوتا'' پی ٹی وی سے نشر ہو رہا ہے۔ اس کھیل میں ہماری مروجہ معاشرتی اقدار کا جس انداز سے تمسخر اُڑایا جا رہا ہے وہ قابلِ فکر ہے۔ تضحیک، تمسخر، پھکڑ پن، سطحی لطیفہ گوئی اور سوقیانہ پن سے بھرپور اِس کھیل میں ایک سیاستدان کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سیاستدانوں کو تمسخر کا نشانہ بنا کر کتھارسس نکالنے کا رواج شعراء میں ہمیشہ سے بہت مقبول رہا ہے لیکن اس کھیل میں سیاستدانوں کا تمسخر کم اُڑایا گیا ہے جبکہ معاشرے کی اعلیٰ اقدار کو زیادہ نشانہ بنایا گیا ہے۔ ایک طرف سیاستدان کی بیوی اپنے میاں سے کھلے بندوں، انتہائی بازاری انداز میں بیوفائی کی مرتکب ہو رہی ہے تو دوسری طرف اُس کی اپنی اولاد اپنے باپ کے بارے میں ایسے ایسے الفاظ استعمال کرتی نظر آتی ہے کہ الاماں الحفیظ۔ ہر بات پر زبان سے لاحول نکلے۔ یہ اور اِسی قسم کے بہت سے دوسرے کھیل ہرگز ہرگز اس قابل نہیں کہ کنبے کے ساتھ بیٹھ کر دیکھے جا سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے آپ کے ٹیکسوں سے پلنے والے میڈیا کو ہدایت دے کہ وہ ہماری آپ کی نمائندگی کر سکے۔ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

خاکسار

امین محمود

غلام احمد فرقت کاکوری

بردکھوا

جوان ہو۔ اچھی تندرستی ہو۔ دونوں وقت بندھے بندھے کھانا ملتا ہو۔ جیب میں پیسے ہوں۔ وہ باپ، چچا یا بڑے بھائی کی کمائی کے ہوں یا ماں چھپا چھپا کر دیتی ہو اس کے بعد اگر کوئی شخص جنت میں جانے کی آرزو کریں تو سمجھ لیجئے کہ یا تو وہ شخص بیمار ہیں یا پھر اُس کے دماغ کے اسکرو ڈھیلے ہیں بہر حال آج جبکہ ہم اپنے گناہوں کے پوٹ نومولود بچوں کی شکل میں لے کر گھر سے نکلتے ہیں تو اکثر چلتے چلتے اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ہائے وہ کیا زمانہ تھا جب ہم نئے نئے یونیورسٹی سے نکل کر باقاعدہ طور پر بیکاری کی زندگی میں داخل ہوئے تھے۔ باقاعدہ اس وجہ سے کہنا پڑتا ہے کہ جہاں تک بیکار ہونے کا تعلق ہے تو وہ تو ہم اُس زمانے میں ہی تھے جب ہم اسکول کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے جاتے تھے اور وہ یوں کہ کالج میں بظاہر آنے جانے سے ہماری والدہ غلطی سے سمجھے ہوئے تھیں کہ ہم پڑھنے لکھنے میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ ہم نے ہر کلاس میں دو دو تین تین سال رُک کر اُن کی اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہا مگر جب وہ نہیں مانیں اور ہم کو پڑھاتی رہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور۔ مگر اس چیز سے ہم کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کالج یا محلے میں کبھی کسی نے فیل ہونے والوں پر کوئی بات چیت کی تو اس میں ہمارا نام دو ایک بار ضرور آیا۔ یہ شہرت ہمیں اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ ساری عمر شرم و حیا کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ یہ خیال فرمایئے کہ ہمارے ہائی سکول کے امتحان کے وقت جو بچے اور بچیاں پیدا ہوئیں وہ سب تعلیم حاصل کر کے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں۔ مگر ہم اپنی وضع پر قائم رہے۔ لیکن سات آٹھ سال بعد جب بی۔ اے میں مسلسل فیل ہونے کے بعد ہم ایک دم سے پاس ہوئے تو ہماری والدہ تو مارے خوشی کے مرتے مرتے بچیں، کیونکہ وہ تمام زندگی ہمارے بارے میں یہ سوچتی رہیں کہ ہم سانپ وانپ قسم کی چیز ہیں جو خاندان کو ڈسنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس ہونے کا سب سے بڑا دکھ اگر کسی کو ہوا تو اُن لڑکیوں کو جو ہماری طالبعلمی کے زمانے میں دو ایک سال اس غلط فہمی کا شکار رہ کر ہم سے یہ سوچ کر محبت کرنے لگیں تھیں کہ شائد ہم آئندہ زندگی میں کسی قابل ہو کر اُن کے کسی کام آسکیں اور اُن کے ساتھ معقول زندگی بسر کر سکیں مگر ہم نے اُن سے اتنا انتظار کرایا کہ اُن میں سے کئی تو شادی کے قابل ہی نہ رہیں اور جنھوں نے شادی کر لی وہ نانی پوتیوں والی ہو گئیں۔ اِن دادی نانی ہو جانے والیوں میں جن جن کی مائیں زندہ تھیں اُن کے کان بھی ہمارے پاس ہونے پر کھڑے ہو گئے کیونکہ ان کو بہر حال اپنی جوان پوتیوں نواسیوں کو پار گھاٹ لگانا ہی تھا۔ انہوں نے ہمارے یہاں ان کے پیغامات بھجوائے جن کی مخالفت ان کی قسمت کی ماری ہوئی ماؤں یعنی ہماری سابق محبوباؤں نے اس وجہ سے کی کہ وہ ہمیں حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں تھیں اور انہوں نے کہنا شروع کیا کہ لڑکے کی عمر بہت زیادہ ہے مگر ان کی اس مخالفت کا جواب ان کی بڑی بوڑھیوں نے یہ دیا کہ لڑکے ذات کی عمر کا کیا پوچھنا؟ مرد ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ پڑھا لکھا لڑکا آج کل میسر کیے

ہے؟ بہت سی عورتیں ایسی بھی تھیں جو ہماری والدہ کو جب مبارکباد دینے آئیں تو باتوں باتوں میں انہوں نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ ہم ان کی لڑکیوں کو گھنٹے آدھا گھنٹے پڑھا دیا کریں۔ مستقل اور براہِ راست پیاموں سے یہ چیز ہم کو زیادہ پسند آئی۔

بہر حال اس قسم کی بہت سی فرمائشوں کو ہم نے لڑکیوں کی شکل وصورت دیکھ کر رد کیا۔ کچھ جنہیں ذرا قبول صورت پایا، انہیں معمولی انکار کے بعد پڑھانا شروع کر دیا۔ اس پڑھانے میں یہ اصول ہمیشہ پیشِ نظر رہا کہ جب تک آؤ بھگت ہوتی رہے پابندی سے پڑھاتے رہے اور جہاں اس میں کچھ کمی دیکھی فوراً پٹڑی بدل کر نئی فرمائش پکڑ لی۔ اِسی درمیان میں ہم ایک دفتر میں ملازم ہو گئے۔ یہ دفتر بھی ایسا تھا کہ جہاں ملازم ہونے کے بعد بھی ماشاللہ ہماری بیکاری میں کوئی فرق نہیں آیا چونکہ یہاں دو چیزیں ایک ساتھ ملتی تھیں۔ یا ملازمت لے لو یا تنخواہ۔ کیونکہ تنخواہ کے لئے پہلی شرط ملازمت تھی اس لئے مجبوراً یہاں کے لوگوں نے ملازمت ہی قبول کر رکھی تھی۔ اس کے بعد تنخواہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تین سال سے مسلسل بیکار رہتے رہتے ہم میں چونکہ بیکاری کا زنگ لگنے لگا تھا اس لئے ہم نے یہ سوچ کر کہ چلو اچھا ہے ملازمت کی عادت ہی پڑ جائے گی، اس جگہ کو قبول کر لیا۔ تنخواہ کا معاملہ یہ تھا کہ چار چھ مہینے میں اگر کبھی اس دفتر کے منیجر صاحب خوش مزگیوں میں آئے تو ایک آدھا مہینے کی تنخواہ دے مرے اور یہی خون تھا جو ان بیکار باکاروں کے منہ کو لگا ہوا تھا ورنہ ہر ملازم اپنے نجی کاموں میں لگا ہوا تھا۔ کچھ ٹیوشن میں مصروف تھے۔ کچھ رات میں مشین پر رولر لڑھکاتے تھے۔ دو ایک پارٹ ٹائم رکشہ بھی کھینچتے تھے اور اس کی اطلاع ہم کو یوں ہوئی کہ ایک مرتبہ ایک تعلقدار صاحب کے یہاں جو غلطی سے ہم کو ملازم سمجھے ہوئے تھے، بر دکھوا بلا آیا اور جلدی میں جو صاحب ہم کو لینے آئے انہوں نے ایک ایسا رکشہ کر لیا جس میں اتفاق سے ہمارے دفتر کے آفس سپرنٹنڈنٹ جُتے ہوئے تھے۔ ہم رات کے اندھیرے میں رکشے میں بیٹھ تو گئے مگر جب ان تعلقدار صاحب کے مکان پر پہنچ کر رکشے سے اُترنے لگے تو ہماری نظر اُن صاحب پر پڑی، ہمارا دل اتنے زور زور سے دھڑکنے لگا کہ ہمارے ہوش وحواس اس وقت تک بجا نہ رہے جب تک وہ رکشے والا ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہو لیا۔

جہاں تک بر دکھوے جانے کا سوال ہے اس میں تین سال کے عرصے میں ہم کافی تجربہ کار ہو چکے تھے مگر اس رکشہ والے نے ہم کو کچھ اس درجہ بدحواس کر دیا کہ ہم ان تمام آداب کو جو ماں اور بہنوں نے ہم کو گھر سے رٹا کر بھیجے تھے بالکل ہی بھول گئے اور جب تک ہم میزبان صاحب کے مکان میں پہنچ کر اچھی طرح ستا نہیں لئے ہم نے کسی کو سلام تک نہ کیا۔ اِس مکان میں جہاں ہم لائے گئے تھے پھاٹک سے نکل کر اندر صحن میں کرسیاں پڑی تھیں جن پر کچھ بوڑھے اور کچھ ادھیڑ عمر والے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ کرسیوں کے بیچوں بیچ ایک سفید داڑھی والے بزرگ تھے جو بالکل سسر نما داڑھی رکھے ہوئے تھے اور جن کی شکل و صورت سے بھکا بھک سسر ہونے کی بُو آرہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہمارے سلام کرنے پر بولے" کہیئے مکان ملنے میں کوئی زحمت تو نہیں ہوئی؟"

ہم نے گھبرا کر اور بغیر اُن کی بات سُنے جواب دیا" جی ہاں سواری مل گئی تھی"۔

اس بے تکے جواب کو سُن کر گرد و پیش بیٹھنے والے زیرِ لب مسکرا کر ہماری طرف غور سے دیکھنے لگے۔

اس کے بعد ایک دوسرے صاحب بولے" آپ کسی محکمے میں ملازم ہیں؟"

ہم نے مری ہوئی آواز میں کہا" جی!"

تیسرے صاحب بولے" ملازمت بھی بڑی نعمت ہے"۔

ہمنے پہلے سے زیادہ مری ہوئی آواز میں کہا" جی!!"

چوتھے صاحب بولے" ارے صاحب! آج کل ملازمت ملتی کسے ہے، پڑھے لکھے رکشہ کھینچ کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

رکشہ کا نام سننا تھا کہ ہمارا دل مر جانے کی حد تک دھڑکنے لگا اور دل سے پکار کر کہنا شروع کیا کہ دیکھ! تجھ پر ہی چوٹیں ہو رہی ہیں۔

اِسی گھبراہٹ میں ایک بزرگ کی نورانی صورت پر جو ہماری نظر پڑی تو ایک دم خدا اور رسول کا خیال ہمارے دل میں جاگ اٹھا اور دل نے ہمیں مشورہ دیا کہ کیا حرج ہے اگر سچ بات اِن جاننے والے بزرگوں سے بیان کر دو۔ کیا عجب ہے جوان کے دل میں ہمدردی کے سوتے اُبل پڑیں اور وہ ہم کو سچا اور ایماندار آدمی سمجھ بیٹھیں اور کوئی معقول صورت نکل آئے کیونکہ کبھی کبھی ایمانداری کی بات بھی فائدہ مند ثابت ہوتی ہے ورنہ حالات جیسے کچھ ہیں وہ تو دیکھ ہی رہے ہو۔ عجب نہیں جو عنقریب گردن میں ہاتھ دے کر باہر کئے جاؤ اور دھوکہ دہی کے جرم میں پولیس کے حوالے کئے جاؤ۔ اِسی درمیان میں ایک صاحب بولے" ارے

صاحب، ہمارے ملک میں تعلیم کی کوئی قدر نہیں، گھوڑوں کو گدھا اور گدھوں کو گھوڑا بنانے میں ماں باپ لگے رہتے ہیں۔ روپے پیسے کے زور سے گدھوں کی گردنیں مروڑ کر بی۔ اے پاس کرالیا جاتا ہے اور جو بیچارے پڑھنے والے ہوتے ہیں وہ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے جاہل رہ جاتے ہیں۔ یہ فقرہ گویا براہِ راست ہماری صلاحیتوں کی طرف اشارہ تھا چنانچہ اس کے سنتے ہی ہماری آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا اور ہمارا بھیانک انجام طرح طرح کی شکلیں بدل کر ہم کو ڈرانے لگا۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب ایک ساتھ ہم پر جھپٹ پڑے ہیں اور ہم کو اندھادھند مار رہے ہیں کبھی آواز آتی تھی رکشے والے تو شریف گھرانے کی لڑکیوں کی قسمت پھوڑنے نکلا ہے سمجھ لے تیری موت تیرے سر پر اٹھا بیٹھیاں کر رہی ہے مگر ہم نے پھر اپنے دل کو مضبوط کیا اور دانت کٹ کٹا کر آخری بار ایک ہنک دار آواز میں کہا'' کی ہاں ٹھیک فرمایا آپ نے''۔

اِسی درمیان میں ایک صاحب نے آ کر کہا'' ہال میں ناشتے پر تشریف لے چلئے''۔

ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور سبھوں کے ساتھ نہایت ادب سے ہال میں داخل ہوئے جہاں ایک نہایت عمدہ قسم کا دسترخوان طرح طرح کے پھل اور مٹھائیاں اپنی آغوش میں لئے ہمارے انتظار میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اب ہم اس سوچ میں پڑ گئے کہ فرش پر بیٹھے میں کون سا پینترا اختیار کریں جو زمانہ حال کے عین مطابق ہو اور مشرقی تہذیب پر پورا پورا فٹ بیٹھے۔ اتنے میں اس ہال کی اوپری منزل سے جو کھسر پھسر اور ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں انہیں سُن کر ہم گھبرا گئے اور نہ جانے کیسے دسترخوان پر ہم اکڑوں بیٹھ گئے۔ اس پر ایک دھیمی آواز سنائی پڑی'' اے ہے نرا بدھو معلوم ہوتا ہے''۔ اس کے بعد ایک کھل کھل کی آواز سنائی پڑی جو کہہ رہی تھی'' بالکل چوسا ہوا آم ہے''۔

ہم اور گھبرا گئے اور ہم نے بغیر اِدھر اُدھر دیکھے دسترخوان پر سے ایک کیلے کی پھلی اُٹھا کر کھانے کی کوشش شروع کر دی۔ اب اتفاق دیکھئے کہ ایک چھلکا نہ جانے کیسے ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر دودھ دان میں گر پڑا جس سے دودھ لڑھک کر دسترخوان پر گر پڑا۔ اس پر ایک بوڑھی آواز کہتی سُنائی پڑی'' اے ہے میرے جہیز کا دسترخوان تباہ کئے دے رہا ہے، اے کوئی رکشے والا معلوم ہوتا ہے''۔

اب ہم بالکل ہی بدحواس ہو گئے مگر پھر حالات پر قابو پانے کے لئے سوچا کہ سامنے بیٹھے والوں کی خاطر مدارات شروع کر کے اس طوفان کا رُخ دوسری طرف موڑ و شائد کام بن جائے۔ یہ خیال آتے ہی ہم نے گھبراہٹ میں ایک بڑی پلیٹ کو جس میں بڑے بڑے امرود رکھے ہوئے تھے اُٹھا کر چائے پینے والوں کے منہ کے پاس لے جانا شروع کر دیا۔ اس پر کچھ لوگوں نے ایسی نظروں سے ہم کو دیکھنا شروع کر دیا جیسے ہم کوئی سخت قسم کی بدتمیزی کر رہے ہیں اور اس گھبراہٹ میں جو چینی کی پلیٹ جو ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر کیتلی پر گر پڑی جس سے کیتلی کی ساری چائے دسترخوان پر اُلٹ پڑی۔ اس پر ایک بوڑھی آواز سنائی دی'' اے ہے پورے چھ سو کا نانی اماں کے جہیز کا سیٹ تباہ ہو کر رہ گیا''۔

اب ہمارے دل نے مشورہ دینا شروع کر دیا کہ استاد قبل اس کے کہ جان جوکھم کی صورت پیدا ہو، کھڑکی سے نکل کر چھلانگ مار کر بھاگ چلو اور ریس کے گھوڑوں کو اپنی چال سے شرارو''۔ لیکن اسی درمیان میں ناشتہ ختم کر کے سب بزرگ اُٹھنا شروع ہو گئے اور انہیں کے پیچھے پیچھے کھسر پھسر کی صلواتوں میں ہم باہر واپس آئے اور گھر پہنچ کر ہم نے والدہ کو اطلاع دی کہ جن لوگوں نے آج ہم کو بلایا تھا نہایت بدتمیز اور نامعقول قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں مگر ہماری خوش نصیبی اور ہماری بیوی کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ اس کے بعد بھی ہماری شادی یہیں ہوئی اور خدا کا شکر ہے کہ ہم اس وقت نو بچوں کے بلاشرکتِ غیرے باپ ہیں اور یہی کام ہے کہ جس میں تعلیم ختم کرنے کے بعد سے اس وقت تک لگے ہوئے ہیں۔

ماہنامہ فروغِ ادب لکھنو جون ۱۹۶۰ء

نوید ظفر کیانی / آرٹ بکوالڈ

ہیٹر کی مرمت کا صحیح طریقہ

گزشتہ سرما کا تذکرہ ہے ہمارے گھر کا پانی گرم کرنے والا ہیٹر خراب ہوگیا، فرانس میں رہنے والے ہی جان سکتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میری بیوی جو پینسلیوینیا کی ٹھنڈی ٹھار مخلوق ہے' اس قسم کے سانحے پر اپنے حواس کھو بیٹھنے میں یدِ طولیٰ رکھتی ہے' محض میرے دھیرج کو دیکھ کر ہی پہلی فلائیٹ سے امریکہ سدھارنے سے باز رہی۔

جب ہفتے کی صبح کو یہ واقعہ وقوع پذیر ہوا'، مجھے کوئی بھی منطق مضطرب ہونے سے باز نہ رکھ سکی۔ یہ پانی کو گرم کرنے والا ہیٹر تھا اور موسم سرما اپنے عنفوانِ شباب پر آیا چاہتا تھا' چنانچہ بندے کو ایسے موقع پر نہ سیاست سوجھتی ہے اور نہ صحافت 'سیدھے سبھاؤ الیکٹریشن کا خیال آتا ہے۔ میں نے الیکٹریشن کو فون کیا اور اُسے بتایا کہ ہمارا پانی گرم کرنے والا ہیٹر اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے۔

الیکٹریشن نے میری معروضات کمال ہمدردی سے سنیں اور پھر کہا کہ چونکہ یہ ایک پانی گرم کرنے والا ہیٹر ہے اس لئے صرف اور صرف پلمبر ہی اس سے نمٹ سکتا ہے۔ میں نے پلمبر کو فون کیا اور اُسے پانی کو گرم کرنے والے ہیٹر کی خرابی کے بارے میں بتایا۔ جواباً اُس نے مجھے الیکٹریشن سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے اُسے آگاہ کیا کہ میں الیکٹریشن سے بات کر چکا ہوں اور اُسی کے مشورہ پر پلمبر کو کال کر رہا ہوں۔ اِس پر اُس نیک بخت نے جواب دیا کہ الیکٹریشن یونہی نخرے کر رہا ہے۔ یوں بھی ہمارا رہائشی علاقہ اُس کے دائرۂ عمل میں نہیں آتا اور اگر بالفرض ایسا ہوتا بھی تو وہ پھر بھی مارچ 1962 تک وہاں آنے سے قاصر ہے کیونکہ اس تمام عرصے تک کے لئے اُسے بک کیا جا چکا ہے۔

میں نے ایک دوسرے الیکٹریشن کو فون کیا لیکن اس بار کمال اُستادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے اِس بات سے ناواقف رکھا کہ قضیہ کس شے کا ہے۔ اُس شریف آدمی نے بتایا کہ وہ ماہِ فروری سے پہلے آنے سے قاصر ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے اور یہ کہ اگر اُس نے کسی کو ہمارے گھر نہیں بھیجا تو سارا مکان جل کر راکھ ہو سکتا ہے جس کے نتائج کی تمام تر ذمہ داری۔۔۔۔۔۔

نتائج کی ذمہ داری کے بھوت کو سر کو منڈلاتے ہوئے دیکھا تو الیکٹریشن صاحب کا دماغ ٹھکانے پر آیا۔ اُس نے فوراً کہا کہ وہ اپنے کسی کامے کو بھیج رہا ہے اور اگر یہ واقعی زندگی اور موت کا معاملہ ہوا تو وہ خود بھی جنوری کے آخری دنوں میں چکر لگا جائے گا۔

میں نے دن کا بقایا حصہ اپنی بیگم کی دلجوئی پر صرف کیا تاکہ وہ امریکہ چلے جانے والی دھمکی کو عملی جامہ نہ پہنائے۔ شام کے چھ بجے کے قریب اُس الیکٹریشن کا آدمی چراغ کے جن کی طرح ظاہر ہوا۔ وہ ایک پستہ قد آدمی تھا' خاکی شرٹ اور پتلون میں ملبوس تھا اور میری اس غیر اخلاقی حرکت پر خاصا سیخ پا دکھائی دے رہا تھا کہ میں نے اُسے ہفتے کی شام کو اتنی دیر سے بُلا کر اُس کا ویک اینڈ

کرکرا کر دیا تھا۔

مسئلہ سے آگاہ کرنے سے پہلے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اُسے ذہنی طور پر اِس جھٹکے کے لئے تیار کیا جائے چنانچہ میں نے اُسے ایک گلاس مشروبِ احمریں کا آفر کیا جسے اُس نے کمالِ شانِ استغناء سے قبول کیا۔ دورانِ مشروب نوشی ہم موجودہ سیاسی حالات، فٹبال کے نتائج، سائکلنگ اور ایتھلیکس کے تازہ مظاہروں پر اظہارِ خیال کرتے رہے۔ میری بیگم جو ہم دونوں کی لایعنی یا غیر متعلقہ گفتگو پر دل ہی دل میں خاصی دیر سے پیچ وتاب کھا رہی تھی اور اپنی شرٹ کے پلو کو مروڑ مروڑ کر بے حال کر رہی تھی، مزید اس سسپنس کو برداشت نہ کر سکی۔

اِسے بتادو۔۔۔۔۔۔۔۔ بالآخر وہ دہاڑی

دوستانہ ماحول کا طلسم ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا اور اُن محترم کو بھی اچانک خیال آگیا کہ وہ ہمارے ہاں کسی ڈیوٹی سے پدھارے ہوئے ہیں۔ اب کوئی امر مانع نہیں تھا کہ اُسے ہیٹر والے کمرے تک نہ لایا جاتا اور اُسے ہیٹر کی سنگین صورتِ حال سے آگاہ نہ کیا جاتا۔

اُس نے ایک نظر ہیٹر پر ڈالی اور بولا ۔۔۔۔ پلمبر کو بلوایئے!!

پلمبر نے کہا تھا کہ آپ کو زحمت دی جائے۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ ہیٹر کا معائنہ کیجئے ۔۔۔ ویسے آپس کی بات ہے، مجھے آپ سے قطعاً توقع نہیں ہے کہ آپ اِسے ٹھیک کرسکیں گے، میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ ایک قابلِ مرمت پانی کو گرم کرنے والا ہیٹر کیسا ہوتا ہے!!!

اُس شخص نے ہیٹر کا خاصے محتاط انداز میں معائنہ فرمایا۔

اِس کا کاؤنٹر ٹوٹ گیا ہے۔۔۔ اُس نے بالآخر کہا۔۔۔ یہ سو سال پرانا کاؤنٹر ہے اور اس کا بوئلر بھی لگ بھگ اتنا ہی پرانا ہے ۔۔۔ مجھے تو یہ معاملہ خاصا حوصلہ شکن دکھائی دے رہا ہے ۔۔۔ آپ کو شائد گھر کی ہر تار کو اتھل پتھل کرنا پڑے پھر بھی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکے گا کہ کام بن جائے گا ۔۔۔ ناممکن ۔۔۔ ناممکن ۔۔۔ اس کا کچھ بھی نہیں ہوسکتا!

آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں ۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ میں ہی احمق تھا کہ آپ کو بلا بھیجا۔۔۔ دراصل ہم جیسے احمق لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ آپ الیکٹریشن حضرات بجلی سے متعلق دنیا کا ہر کام کر سکتے ہیں۔۔۔ یہ قطعاً ناممکن ہے ۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ۔۔۔ واقعی! اسے کم از کم کوئی الیکٹریشن ہرگز ہرگز ٹھیک نہیں کرسکتا

علیگڑھ یونیورسٹی میں آل انڈیا مشاعرہ تھا پورے ہندوستان سے شعراء مدعو تھے، شعرا کا ایک جمِ غفیر یونیورسٹی پہنچا ہوا تھا۔ اِن شعراء میں دو سگے بھائی " کاندھلے " سے بھی آئے ہوئے تھے اور یہ دونوں بھائی اتّفاق سے گنجے تھے اور بہت ہی شریر قسم کے واقع ہوئے تھے۔ اِن دونوں نے اپنے قہقہوں اور پھبتیوں سے پورا پنڈال سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب یہ سارا ماجرا بے بسی سے دیکھ رہے تھے لیکن کچھ کہتے نہ بنتی تھی۔ اُدھر مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی کچھ اساتذہ کا انتظار ہو رہا تھا۔ اِس مشاعرہ کا مصرعِ طرح قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا تھا۔ جب یہ دونوں گنجے شاعر بھائی کسی طرح چپ نہ ہوئے تو مولانا صاحب سے نہ رہا گیا۔ مولانا صاحب اٹھے اور مائیک پر تشریف لائے اور یوں گویا ہوئے۔

حاضرینِ مشاعرہ شروع ہونے میں ابھی شاید کچھ اور دیر لگے اس لیے جب تک میں نے جو اس مصرعِ طرح میں گرہ لگائی ہے وہ سماعت فرمایئے۔

جب خاموشی طاری ہوگئی تو مولانا نے گرہ کا شعر پڑھا، فرمایا

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے ساتھ گنج
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

بس جناب پھر کیا تھا' پورا پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا اور وہ دونوں گنجے شاعر بھائی ایسے بھیگی بلی بن کر بیٹھے کہ جیسے مشاعرے میں شریک ہی نہ ہوں۔

۔۔۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔۔۔ آپ نے میرے اندازے کی تصدیق کردی۔۔۔ شکریہ!!

لیکن اِسے ٹھیک کیا جا سکتا ہے ۔۔۔ اُس شخص نے تقریباً احتجاج کرنے والے انداز میں کہا۔

یہاں کا کوئی الیکٹریشن اِسے ٹھیک نہیں کرسکتا۔۔۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔۔۔ یہ ناممکن ہے!!

میں اِسے ٹھیک کر سکتا ہوں۔۔۔الیکٹریشن نے گویا انکشاف کیا۔۔۔میں بجلی کا ہر کام کر سکتا ہوں!

میں ایسا نہیں سمجھتا۔۔۔۔۔۔میں نے کہا۔۔۔میرا نہیں خیال کہ فرانس جیسے ملک کا الیکٹریشن اِسے ٹھیک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔۔۔کبھی نہیں۔۔۔ساری زندگی بھی لگا رہے، تب بھی نہیں۔۔۔!!!

کوئی ایسا برقی بوائلر نہیں ہے جسے میں ٹھیک نہ کر سکوں۔۔۔ وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولا۔۔۔میں تو اس سے دوگنے خراب ہیٹروں کو ٹھیک کر چکا ہوں۔۔۔!

موسیو! میری عادت نہیں ہے کہ میں کسی دھن کے پکے شخص کو بلاوجہ چیلنج کرتا پھروں لیکن جہاں تک اِس ہیٹر کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ آپ اپنی صلاحیتوں کے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔۔۔!!

اُس پستہ قامت کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔۔۔۔میں کل دوبارہ آؤں گا اور آپ خود دیکھ لیجئے گا میں اِس ہیٹر کو ٹھیک کر سکتا ہوں یا نہیں!

کل تو اتوار ہے۔۔۔میں نے اعتراض کیا

کوئی بات نہیں۔۔۔میں پھر بھی آؤں گا اور آپ کو دکھاؤں گا کہ مجھے بجلی کے کام کا کتنا تجربہ ہے!!!

چھوڑیں بھی جناب۔۔۔میں نے کہا۔۔۔آپ محض اپنا قیمتی وقت ہی برباد کریں گے۔

میری بیوی جو میری لن ترانیوں کی رمز کو پا گئی تھی، شفار شانہ انداز میں بولی۔۔۔اجی چھوڑئے بھی۔۔۔اِسے کوشش کر لینے دیجئے۔۔۔یہ کہہ جو رہا ہے کہ یہ اس ہیٹر کو ٹھیک کر سکتا ہے!

میں نے بظاہر ہچکچاتے ہوئے اُس الیکٹریشن کو اجازت دے دی کہ وہ اگلے روز یعنی اتوار کو آئے اور میرے قابلِ مرمت ہیٹر کے ضمن میں اپنی صاحیتوں کو آزمالے۔

اگلے دن وہ الیکٹریشن علی الصباح آیا اور بمشکل آدھے گھنٹے میں اُس ہیٹر کو نہ صرف ٹھیک کیا بلکہ چالو کر کے بھی دکھا دیا۔

میں نے اُسے ازرہِ تہنیت مشروبِ احمریں پیش کیا اور اُس کی صلاھیتوں پر شک کرنے پر معذرت چاہی۔

فتح کے نشہ میں چور اُس نے کمال مہربانی سے میری معذرت قبول کی اور بتایا کہ اس میں کچھ میرا ہی قصور نہیں ہے۔ دراصل میں نے یہی دیکھا ہوا ہے کہ امریکہ میں اس قسم کے خراب ہیٹروں کو پھینک دیا جاتا ہے لیکن یہاں فرانس میں ایسا نہیں ہوتا۔ فرانس میں ایسے قابلِ رشک الیکٹریشن موجود ہیں جو خراب سے خراب ہیٹروں کو ٹھیک کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔

وہ خوشی خوشی رخصت ہوا اور میں بھی کئی ایک وجوہات کی بناء پر خاصا خوش تھا۔ ایک تو میرا ہیٹر ٹھیک ہو گیا تھا۔ دوسرا یہ امر بھی اطمیان بخش تھا کہ ایک امریکی میں بہرحال اتنی صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے کسی فرانسیسی بھائی کو خوشی بخش سکے۔۔۔۔آپ کا کیا خیال ہے؟

ایک بار مولانا ظفر علی خاں کو دُھن سمائی کہ اگر ہند بھر کے مسلمان ایک ایک روپیہ بھی چندے کے طور پر جمع کریں تو کروڑوں روپے جمع ہو سکتے ہیں۔ اس خطیر رقم سے خانہ خدا کی تعمیر ہونا ممکن ہے۔ اپنے ہمراہیوں کو لے کر جب وہ ایک میراثی کے درِ دولت پر گئے تو میراثی اور میراثن دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے عجز و انکساری کے ساتھ مقصد بیان کیا تو میراثی نے بڑے فخر سے کہا "مولانا! لکھ لیجیے پانچ روپے۔۔۔" ابھی مولانا قلم کو حرکت میں لانا ہی چاہتے تھے کہ میراثن بول اٹھی۔ "واہ میاں واہ، خانہ خدا کی تعمیر اور صرف پانچ روپے چندہ، میاں یہ تو ہم سے نہ ہوگا، ذرا زیادہ رقم دو"۔

میراثی نے منہ پھلا کر کہا۔ "مولانا دس روپے لکھ دو۔" پیش تر اس کے کہ مولانا قلم کو جنبش دیتے میراثن پکار اٹھی۔ "نا میاں! دس روپے کوئی عطیہ ہوتا ہے؟"

میراثی نے جھٹ سے کہا "مولانا پندرہ روپے لکھ لیں"۔ میراثن تڑپ کر بولی۔ "میاں! کیوں شرمندہ کرتے ہو، پندرہ روپے، بھلا کیا ہوتے ہیں"؟

میراثی بیس سے تیس اور پھر چھلانگ لگا کر پچاس پر پہنچا۔ زچ ہو کر مولانا نے کہا "دادا جتنی رقم دینا چاہتے ہو، اتنی ہی لکھوا دو"۔

میراثی نے نہایت سادگی سے جواب دیا "مولانا غریبوں کے ہاں نمک، نہ آٹا، بھلا ہم کیا چندہ دیں گے، البتہ ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ گنتی ہم لوگوں کو بھی آتی ہے"۔

محمد عاطف مرزا

انگریزی حروفِ تہجی (Alphabates) میں سے دوسرے یا سیریل ٹو (2) اور بائیسویں یا سیریل ٹوینٹی ٹو (22) پر آنے والے دو حروف ''بی'' (B) اور ''وی'' (V) الگ الگ تو شاید کسی خاص اہمیت کے حامل نہ ہوں لیکن یہ دونوں مل کر ایک بہت خطرناک لفظ ''بیوی'' (BV) بناتے ہیں جی ہاں یہی بیوی دنیا کے تقریباً اسی فی صد مردوں یا شوہروں کی زندگی میں آکر دل دہلا دینے والا کردار ہے جو انہیں بنانے یا بگاڑنے میں پیش پیش ہوتا ہے۔

عورت کے چار روپ ہیں----ماں، بہن، بیوی، بیٹی۔ یہ چاروں روپ اہم ہونے کے ساتھ ساتھ مقدس بھی ہیں۔ ان میں سے فی الوقت بیوی پر قلم زنی کا محل بن رہا ہے۔ اِس لیے آغاز میں ہی ''بیوی قبیلے'' سے معذرت کرلی جائے تو بہتر ہے۔

بیوی مرد کی زندگی میں آنے والی وہ خاتون ہوتی ہے جو اُسے سکون بھی دے سکتی ہے اور مبتلائے اضطراب وعذاب بھی کرسکتی ہے۔ وفا شعار بیوی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ کسی بھی دین ومذہب کے مطابق ایک مرد اور عورت کو میاں بیوی کے رشتے میں باندھنے کے علاوہ ایک ضروری رشتہ اعتماد کا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ یہ بات شاید اُس وقت کہی گئی تھی جب دنیا میں دو پہیوں والی گاڑیاں مستعمل تھیں۔ پوری دنیا مل کر یہ بات طے نہیں کرسکی کہ بات گدھا گاڑی یا ٹانگے کے لیے کہی گئی تھی یا سائیکل کے لیے۔ بات سے بات نکلتی ہے تو یہ بھی کوئی نہ جان پایا کہ اگر یہ گدھا گاڑی یا ٹانگے کے پہیے ہیں تو ان میں سے دائیں والا کون سا ہے اور بائیں والا کون سا۔ اگر سائیکل ہے تو آگے اور پیچھے والے پہیوں کا جھگڑا ضرور سامنے آئے گا۔ بہرحال یہ دونوں کسی بھی طرف کے پہیے ہوں، مل کر ہی زندگی کی گاڑی چلاتے ہیں۔

اِس کائنات میں بحیثیت انسان وجود میں آنے والی دوسری ہستی عورت تھی جسے پہلے ہی لمحے بیوی کے اعلیٰ ترین رتبے پر فائز کردیا گیا اور آدم کی زمین پر آبادکاری کی کئی وجوہات میں سے ایک کا سہرا بلکہ گھونگھٹ اسی بیوی کے سر ہے۔

وجود میں آتے ہی بیوی کے ذمہ کافی سارے کام لگائے گئے اور کچھ اِس نے خود اپنے ذمہ لے لیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کام اختیارات کا درجہ حاصل کرتے گئے۔ اِن خود ساختہ اختیارات میں شوہر کی کڑی نگرانی، اُس کی جیبوں کی تلاشی، بٹوے سے

چوری چھپے یا زبردستی رقم نکلوانا، شوہر کے لیے بے سکونی کا انتظام کرنا، دوسری خواتین سے راہ ورسم میں رکاوٹیں پیدا کرنا، شوہر کے دوستوں کو گنوار اور جاہل سمجھنا اور اُن کے آنے پر بے تکی گفتگو کرنا، اپنے میکے کی تعریف و توصیف اور سسرال کی توہین و تحریف میں مبالغے سے کام لینا وغیرہ شامل ہے۔ اِن تمام کے علاوہ کچھ ''بیوی ترس'' شوہر خواہ مخواہ بیویوں کو بہت سارے مابدیدی اختیارات سونپ کر پرسکون ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ سراسر شوہرانہ قوانین کی خلاف ورزی ہوتی ہے، جس کا خمیازہ وہ ساری زندگی بھگتتے رہتے ہیں۔

فی زمانی بیویوں کی کئی اقسام ہیں، جن پر کئی ادیب اور شاعر وغیرہ قلم زنی کر چکے ہیں اور قرین از قیاس امر ہے کہ ہم یہاں اقسام کو گنوا کر اپنے انشائیے پر سرقہ کا الزام بھی نہیں لگوانا چاہتے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تمام شوہروں کو بیویوں کی تقریباً تمام اقسام کا بخوبی علم ہے، خود بیویوں کو بھی اپنی تماش یا قسم کا ادراک ہوتا ہے۔ کچھ خصوصی اقسام ہیں جن کے بارے میں ابھی دنیا کو آگاہ کیا جانا لازمی ہے، تاخیر کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان پر مزید تحقیق جاری ہے اور خاطر خواہ نتائج سامنے آنے کے بعد ہی اِن اہم اقسام کو طشت از بام کیا جائے گا۔

ایک مشہور مقولہ ہے کہ کسی بھی کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور اکثر یہ عورت اُس مرد کی ذاتی بیوی ہوتی ہے۔ اسی طرح ناکام مرد کے پیچھے بھی ایک یا ایک سے زیادہ عورتوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اِس معاملے میں بیوی اپنی بھی ہوسکتی ہے کسی اور کی بھی یا کوئی اور خصوصی قسم کی عورت بھی اِس ناکامی کے اسباب میں ملوث پائی جاسکتی ہے۔

بیوی ہونا ایک انتہائی مشکل کام ہے، ویسے تو عورت ہونا ہی ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔ وہ ایسے کہ بیوی کی آزمائش اور امتحان کا پہلا پرچہ اُس دن اُس کے سامنے آتا ہے جس دن وہ کسی اجنبی کے ساتھ اپنی باقی زندگی گزارنے کا عہد کرتی ہے۔ ایک گھر جس میں اُس نے زندگی کی کئی بہاریں اور خزائیں، شام وسحر گزارتے ہوتے ہیں، اُسے چھوڑ کر ایک نئے ماحول میں بسنا اُس کی زندگی کی بہت بڑی قربانی ہوتی ہے اور اُس کے بعد وہ پے در پے قربانیاں دیتی چلی آتی ہے۔ بیوی ہونا ایک جز وقتی نہیں بلکہ کل وقتی کام ہے۔ صبح منہ اندھیرے اٹھ کر سب کے لیے ناشتہ بنانے سے لے کر رات کے کھانے کے بعد برتن دھونے تک، صبح بستر سمیٹنے سے رات کو سونے کے بستر بچھانے تک، بچوں کو سکول اور شوہر کو دفتر یا کام پر بھیجنے کے بعد سے ان کے واپس آنے تک یہ مخلوق مصروف ہی رہتی ہے۔ مردوں کو کاروبار یا دفتر سے تو ہفتے میں چھٹی مل جاتی ہے مگر اسے کوئی رخصت نہیں ملتی۔ مرد بیمار ہو تو یہ خدمت اور عیادت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھتی۔ مگر اس کے سر میں درد ہو بھی تو کھانا اسے ہی بنانا ہوتا ہے۔

ہر ایک بیوی کا سب سے بڑا خواب اپنا گھر بنانا، سجانا، سنوارنا ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی درجے یا طبقے سے تعلق رکھتی ہو، اپنی بساط سے بڑھ کر اپنے گھر کی تزئین و آرائش اپنا فرض سمجھتی ہے۔ وہ خواہ شکاگو سے ہو یا بیجنگ سے، دوہا سے ہو یا جدہ سے، لاہور سے ہو یا کابل سے یہ اُس کی سرشت میں شامل ہوتا ہے۔ صحرائے تھر میں ایک عورت کو اپنے گھر کی تزئین و آرائش مٹی اور گوٹے کناری سے کرتا دیکھنے کا اتفاق ہوا تو میں نے سوچا کہ وہ دنیا کا بہترین اور خوبصورت گھر تھا۔ کسی عورت کی بدترین دشمن حتیٰ کہ بہترین دوست اُس کی ساس یا اُس کے شوہر کی ماں ہوتی ہے۔ یہ قسمت کی بات بھی ہے اور اُس کی محنت اور محبت بھی کہ وہ ساس کو دوست بناتی ہے یا دشمن۔ ویسے دونوں میں دوستی ہو جائے تو فائدہ مرد کو ہوتا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ دونوں میں ٹھن جائے تو تب بھی مفعول بیچارہ مرد ہی ہوتا ہے۔

چلتے چلتے آزاد نسواں کا ذکر بھی انتہائی مناسب ہوگا۔ اگر دیکھا جائے تو آزادی نسواں کے نام پر اگر کوئی جنس متاثر یا استحصال زدہ ہے تو وہ خود عورت ہے۔ خاص طور پر ہمارے معاشرے میں جہاں مرد باورچی خانے میں جانا، برتن یا کپڑے دھونا، بچوں کو سنبھالنا گوارہ نہیں کرتا، وہاں اگر عورت کسی دفتر میں کام کرتی ہو تو اُسے اپنے دفتر کے علاوہ گھر کے تمام کام بھی اُسی معیار کے مطابق کرنے ہوں گے۔

بیوی زندگی کے سٹیج پر بیک وقت کئی کردار ادا کر رہی ہوتی ہے۔ اُسے بیوی ہونے کے علاوہ محبوبہ، ماں، بیٹی، بہن، نوکرانی، باورچن، پرسنل سیکرٹری، منتظم وغیرہ کی بھرپور اور مکمل اداکاری کرنی پڑتی ہے اور ہر کوئی اُس سے یہ توقع کر رہا ہوتا ہے کہ وہ یہ تمام کردار مکمل طور پر بغیر کسی داد و تحسین کے نبھائے۔

اوراقِ تاریخ میں کئی نامی گرامی بیویوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ حوا کے قبیلے سے تعلق رکھنے والی بیوی نامی اِس قابلِ قدر ہستی کے ذکر کے بغیر تاریخ بھی تکمیل کی سند نہیں پا سکتی۔ پیغمبروں، صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کی معتبر بیویوں کے علاوہ کئی بادشاہوں، شاعروں، ادیبوں، سیاستدانوں، سائنس دانوں، اساتذہ وغیرہ کی بیویوں کے حوالے بھی کئی معتبر تاریخ دانوں نے دیے مگر تقریباً سب اپنی بیوی کا تذکرہ بھول گئے، جیسے میں اِس انشائیے میں اپنی خاتونِ خانہ کا تذکرہ گول کر رہا ہوں۔ لہٰذا! آج سے تمام تاریخ دانوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی بیوی کا تذکرہ بھی ضرور کریں تاکہ بوقت ضرورت جان بخشی کے لیے سند کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

حُسنِ نظر

ایک ڈھابے سے اٹھتا شعر

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

ایک مالی کا مسئلہ

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے، پھول کدھر جائے گا

ایک غوطہ خور کا کہنا

سمندر میں اترتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
کسی سے بات کرتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

ایک ڈاکیے کا تجسس

تمہارے خط میں نیا اِک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

ایک اندھے کی خواہش

چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

ایک مریضہ کی شکایت

سوکھے ہونٹ سلگتی آنکھیں سرسوں جیسا رنگ
برسوں بعد وہ دیکھ کے مجھ کو رہ جائے گا دنگ

کرایہ دار کی حسرت

میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اسکو گھر کر دے

محکمہ موسمیات کا گلہ

لائی ہے اب اڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رُت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو

ایک بیوی کی بیزاری

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال سنواروں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا، میں باہر جاؤں تو کس کے لیے

ایک ملاح کا شکوہ

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پہ ساحل کی تمنا کون کرے

کائنات بشیر

مرزا یاسین بیگ

پاکستان کہاں نہیں ہے

پاکستان سے باہر نکلا تو ڈر تھا کہ ڈار سے بچھڑے پرندے کی طرح میں ساری زندگی پھڑ پھڑاتا، ترستا نہ رہ جاؤں۔ ٹورانٹو میں قدم جمے تو یہ خوف کچھ کم ہوا۔ سائنس کی کرامت نے مجھے اپنوں سے کبھی دور نہیں کیا تھا اور جو کچھ نزدیک تھا اس میں بھی پاکستان کی خوشبو ہی خوشبو تھی۔

کینیڈا کے شہر ''مسی ساگا'' میں اپنا گھونسلہ بنایا اور پاکستان سے بیوی بچوں کو بلا کر تنکے جمع کرنے شروع کر دیے۔ فیلڈ کی جاب نہ ملی مگر اتنے پیسے ضرور ملنے لگے کہ کچن کی ضرورتیں با آسانی پوری ہونے لگیں۔ لکھنے اور پڑھنے کا جو ''جسیمہ'' خون کے اندر تھا وہ پھر جوش مارنے لگا۔ خالد عرفان نے نیویارک سے کالم کا تقاضا شروع کیا تو ٹورانٹو کی پانچویں رات سے ہی قلم اور کاغذ دوبارہ سرہانے آ گیا۔ چند مہینے گزرے تو 25 سال سے ٹورانٹو سے نکلنے والے ہفت روزہ ''پاکیزہ'' میں بھی ''قلم بیتی'' کو جگہ مل گئی۔

بچوں نے اسکول جانا شروع کیا، بیوی نے کچن اور ''روٹی روزی'' کا ساتھ دینے کی ابتدا کی تو زندگی ایک ڈھب پر آ گئی۔ کچھ لوگ مسلسل ڈراتے رہے۔ بچے بگڑ جائیں گے، بیوی ہاتھ سے نکل جائے گی، مذہب چھوٹ جائے گا، کلچر کے گراس روٹ پر دراڑیں پڑنی شروع ہو جائیں گی مگر الحمدللہ چوتھا سال لگ چکا ہے ،سب کچھ ٹھیک اور مشرقی سمت میں ہے۔

میں کبھی بھی ان معنوں میں پکا مسلمان نہیں رہا کہ پنج وقتہ نمازیں پڑھتا رہوں اور اللہ سے ڈر کر اسے عبادت کی رشوت پیش کرتا رہوں۔ میں نے کبھی اللہ سے خوف نہیں کھایا اسے دوست بنا کر رکھا۔ اس سے باتیں کرتا رہا، اس سے مدد مانگتا رہا، اسے بتاتا رہا کہ تم ہی میرے ہمدم اور مسیحا ہو، میں تمہاری فرضیت پوری کرنے میں غفلت ضرور کرتا ہوں مگر تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔ اللہ نے بھی شاید یہ بات سمجھ لی کہ میں اس کی اور اس کے بندے کی پوری تعظیم کرتا ہوں۔ محنت کرتا ہوں اور دنیاوی ہوس کے لیے اس کے بندوں کو شکار نہیں کرتا۔ وہ میری محنت اور لگن کا صلہ جتنے ڈالر میں بھی ادا کر دیتا ہے اسے خاموشی سے اکاؤنٹ میں رکھ کر اپنی جائز ضرورتوں کے لیے خرچ کرتا رہتا ہوں۔

اپنی اور اپنوں سے منسلک رشتوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد جب میں نے اپنے اطراف نظر ڈالی تو مجھے ایسا لگا جیسے کچھ نہیں بدلا۔ جس مٹی پر میرے ہاتھ پاؤں پڑتے ہیں اس میں وطن کی خوشبو تو نہیں مگر اس میں اجنبیت کی باس بھی نہیں۔ میں ایک ایسا پودا ہوں جسے ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگا دیا گیا ہے۔ اب اس نئی مٹی میں جڑ پکڑنے کے لیے مجھے وقت اور موسم کے تقاضوں کا انتظار کرنا ہے۔ مجھے وقت سے پہلے یہ دہائی دینے کی ضرورت نہیں کہ میرے پتے ہرے کیوں نہیں ہو رہے؟ میری شاخوں میں کونپلیں اور پھول کیوں نہیں پھوٹ رہے؟ میں پھل دار کیوں نہیں ہو رہا؟ مجھے خوشی اور اطمینان ہے کہ میری جڑوں نے کینیڈا کی سرد سرزمین میں اپنے پنجے گاڑ لیے ہیں مجھے بھی اس چمن میں اپنے آپ کو بار آور کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی جگہ مل گئی ہے۔

یہ ربطِ باہمی کا معجزہ ہے
ہمارا دال دلیا چل پڑا ہے
میں بیوی کی وکالت کر رہا ہوں
تو شوہر کی طرف سے لڑ رہا ہے

نوید ظفر کیانی

پاکستان سے نکل رہا تھا تو ہر طرف صدائیں تھیں کہ یہ ملک ٹوٹ جائے گا۔ پاکستان کمزور ترین ملک ہے! پاکستان دن بہ دن انجام کو پہنچ رہا ہے؟ پاکستان کو کوئی Like نہیں کرتا! پاکستان اقوامِ عالم میں تنہا رہ گیا ہے! پاکستان DrainBrain کا شکار ہے! میں ڈپریشن کے ساتھ پاسپورٹ پہ Exit کی مہر لگوا رہا تھا۔ مگر اب چار سال بعد پاکستان سے دور رہ کر مجھے اندازہ ہوا کہ پاکستان اور پاکستانی دونوں مضبوط ہیں۔ پاکستان سے جو بیج باہر کسی دیس میں گرا، اس نے نمو پا کر پاکستانی درخت کی ہی شکل اختیار کی۔ کینیڈا میں بیٹھ کر میں نے جہاں جہاں، جس جس ملک میں نظر دوڑائی ہر جگہ ''منی پاکستان'' ہی کا شور سنا۔ امریکہ کے پاکستانی، کینیڈا کے پاکستانی، یورپ کے پاکستانی، مڈل ایسٹ کے پاکستانی ہر ملک میں ایک ''منی پاکستان'' موجود ہے۔

کیا فرق پڑتا ہے کہ ان میں سے کچھ، پاکستانیوں کا نام بدنام کر رہے ہیں مگر ان میں بڑی تعداد ایسی ہے جو پاکستان کا نام روشن کر رہی ہے۔ بدیس میں بیٹھ کر اپنے دیس، اپنے کلچر، اپنے وطن کی خوشبوؤں سے ہواؤں کو معطر کر رہی ہے۔ اگر میرے موجودہ شہر میں 20 نائٹ کلب ہیں تو 10 مساجد بھی ہیں۔ میں باہر ننگے جسموں کی نمائش دیکھتا ہوں تو گھر آ کر اپنی بیوی کی مشرقیت اور پاکیزیت میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں چوائس کی دنیا میں ہوں۔ مجھے اب حسرت نہیں رہی کہ الکحل اور ننگے جسم کی پوشیدہ سائیکی سے اپنی نیت کو ہمیشہ خراب رکھوں۔ اب میں تھرڈ ورلڈ کا وہ باشندہ ہوں جس میں اب کوئی حسرت اور بے اطمینانی نہیں۔ میرے بچے زیادہ پکے مسلمان ہیں اس لیے کہ وہ دوسرے مذاہب کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی پسند اور سوالوں کے تسلی بخش جوابوں کے ساتھ اسلام کی پٹری پر چل رہے ہیں۔

وہ کچھ کھانے سے پہلے Ingredient کو خود چیک کرتے اور اپنے لیے حلال چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ حلال کی اتنی پہچان شاید ہمارے پاکستان میں بسے مسلمانوں کو بھی نہ ہو۔

میں بہت خوش ہوں کہ دنیا کے جس ملک سے بھی اپنے کسی دوست کا فون وصول کرتا ہوں وہ خوش دلی سے بتاتا ہے کہ اس کے شہر میں کتنے پاکستانی ہیں؟ کتنی مساجد ہیں؟ کتنے اردو اخبار ہیں اور کتنے ٹی وی چینل چل رہے ہیں؟

آج شہزادہ گلفام سے فون پر بات ہوئی تو ایک بار پھر باغ باغ ہو گیا۔ سلطانہ مہر اور جاوید چوہدری صاحب نے ان کے شہر کی ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات بتائیں تو میں کھل کھِل اٹھا۔ پتہ نہیں وہ کون ہیں جو دیارِ غیر میں بھی ڈپریس رہتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کون ہیں جو اس بات کا دکھ اٹھائے پھرتے ہیں کہ ان کے بچے اب ان کے نہیں رہے؟ کہیں نہ کہیں ہمارے اندر کوئی کمی تھی شاید انہوں نے اللہ کو اپنا دوست نہ بنایا ہو صرف اللہ سے خوف کھاتے رہے ہوں جبھی زندگی کا کوئی پہلوان سے دور ہو گیا۔

گلفام 23 سال پہلے یو۔ کے آیا تھا اور آج 23 سال بعد میں نے فون پر اس کے قہقہے میں پہلے جیسی تر و تازہ پاکستانی کی رمق محسوس کی۔ سلطانہ مہر آج یہاں بھی اسی ''روپ'' میں ہیں جیسی وہ پاکستان میں ہوتی تھیں۔ میرے ٹین ایجر بچے آج بھی صبح اٹھتے ہی کلمہ پڑھتے ہیں اور ہم سب کو سلام کرتے ہیں ایسے میں کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ پاکستان کمزور ہے یا پاکستان ٹوٹ رہا ہے۔ پاکستان تو اُبھر رہا ہے۔ جگہ جگہ، ملک ملک، خطے خطے، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان کو ایک لڑی میں پرو کر رہنے کا ہنر آ جائے۔

شوکت علی مظفرؔ

نائی عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں، خاندانی، حادثاتی اور طعنے والے۔ خاندانی نائی جدی پشتی نائی ہوتا ہے، یعنی اس کا دادا، پردادا بھی نائی تھا، باپ بھی نائی تھا اور بیٹا بھی نائی ہوگا۔ خاندانی نائی ہمیشہ اپنا استرا ساتھ رکھ کر سوتا ہے، کیا پتہ خواب میں بھی کسی کی حجامت کرنی پڑ جائے۔ حادثاتی نائی وہ ہوتا ہے جس کو کوئی کام نہیں ملتا تو وہ پیٹ پالنے کے لیے لوگوں کا سر مونڈنا شروع کر دیتا ہے، اس کو آج کل ہیئر ڈریسر بھی کہتے ہیں۔ مَلک سے ایک بار میں نے ہیئر ڈریسر کا مطلب پوچھا تو جواب ملا: ''بالوں والا درزی۔'' شاید مَلک کو ڈریس سے مغالطہ ہوا ہوگا۔ طعنے والے نائی وہ ہوتے ہیں جو حقیقت میں نائی نہیں ہوتے مثلاً: آپ گاڑی چلا رہے ہوں اور ذرا سی غلطی کر دیں تو آپ کی غلطی کے نتیجے میں جو دوسرا ڈرائیور ہے وہ آپ کو فوراً کہے گا ''ڈرائیور ہے کہ نائی ہے۔''

آپ بس میں سوار ہیں اور ڈرائیور سست رفتاری سے گاڑی چلا رہا تو کہیں نہ کہیں سے آواز آئے گی ''ڈرائیور ہے کہ نائی ہے جو گاڑی نہیں چل رہی۔'' دو بندے بحث کر رہے ہوں اور جب کوئی تنگ آ کر دلیل نہیں دے سکتا تو اپنی بات کو وزنی بنانے کے لیے کہتا ہے ''مجھے کیا نائی سمجھ رکھا ہے۔''

یہ نائی ہے کیا بلا؟ اناڑی یا کھلاڑی؟ ماہر یا ناکارہ؟ فن کار یا اُلو کا پٹھا جس کے سر ہر غلط کام منڈھ دیا جاتا ہے۔ اس نائی کو ''مشکل'' اُردو میں حجام کہا جاتا ہے۔ پہلے حجاموں کے ہاں حمام بھی ہوا کرتے تھے جہاں اکثر لوگ ایک ہی حمام میں ننگے ہوجایا کرتے تھے، اب حمام تو نہیں رہے البتہ اس میں عریاں بہت سے لوگ اب بھی ہیں اور جو نہیں وہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کسی طرح ہوجائیں۔ یہ حجام نہ ہوں تو لڑکوں کے بے تکے بال کون کھڑے گا؟ انہیں گجنی اور گنجی کٹ کون کر کے دے گا؟ یہ جو لڑکیوں کے سامنے زلفیں سنوارتے لڑکے اُسے پٹانے کی کوشش کرتے ہیں ان سنورتی زلفوں کو اصل سنوارنے والا حجام ہی ہوتا ہے، مگر پھر بھی معلوم نہیں کیوں لوگوں نے نائی کو طعنہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

حجام تو وہ افلاطون چیز ہے جس کے سامنے بادشاہ وقت بھی سر جھکانے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ چاہے تو بادشاہ کی زلفوں کی مناسب تراش خراش کر کے اس کی شان بڑھا دے، یا پھر فلم اسٹار

شان بنادے۔ حجام چاہے تو مونچھوں پر پیار سے استرا قینچی پھیر کر بادشاہ سلامت کا وقار بڑھا دے یا پھر چارلی چپلن جیسا فنکار بنادے۔ حجام کی عظمت کا تو استاد ابونثر نے بچوں کی ایک نظم میں اِس طرح اعتراف کیا ہے کہ

کیوں لمبے بال ہیں بھالو کے،
کیوں اس کی ٹنڈ کرائی نہیں
کیا وہ بھی گندا بچہ ہے
یااس کے ابو، بھائی نہیں
یہ اس کا ہیئر اسٹائل ہے
یا جنگل میں کوئی نائی نہیں
یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

ہمیں بھی حجام عرف نائیوں عرف ہیئر ڈریسرز کی مقامی حیثیت کی سمجھ نہیں آرہی ہے، وہ ماہر ہیں تو کوئی ان کی عظمت کا اعتراف کیوں نہیں کرتا، اگر ناکارہ ہیں تو پھر ان کا کام دن بدن پھلتا پھولتا کیسے جارہا ہے؟ دراصل ہم منافق لوگ ہیں کسی کی حقیقت کا اعتراف کرنے سے کتراتے ہیں اور خود کو دوسروں سے اسی طرح برتر و اعلا سمجھتے ہیں جیسے کہ آج کل امریکا سمجھ رہا ہے۔ مانا کہ حجام کی ذات کم درجے کی ہے، لوگ اسے جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں مگر وہ تمام درجے والوں کو اپنی قینچی کی نوک پر رکھتا ہے۔

ہر بندہ اپنی ذات میں نائی بھی ہوتا ہے، مگر عرفان ذات نہ ہونے کے سبب اسے احساس نہیں ہوتا کہ وہ روز یا دوسرے دن شیو کرتا ہے وہ کیا چیز ہے؟ ناک کے بال اُکھاڑتا ہے اور ناخن تراشتا ہے تو وہ کیا کام ہے؟ باقی آپ خود سمجھ دار ہیں، عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ مَلک صاحب کے کان یہاں غصے سے سرخ ہوگئے کہ ہم نے مردوں کے اندر تو حجام پیدا کردیا ہے مگر عورتیں کیوں بچ رہی ہیں۔ پتہ نہیں مَلکوں کا عورتوں سے اتنا بیر کیوں ہوتا ہے، وہ عورتوں کسی کام میں آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتے ہیں، یہی دیکھ لیں کہ رحمٰن مَلک کے مقابلے میں وینا ملک نے نام کمانا شروع کیا تو ان کے مقابلے کے لیے مَلک ریاض میدان میں آگئے۔ بہرحال ہر عورت بھی نائن ہوتی ہے کیونکہ پرانے زمانے میں نائی حجامت کے ساتھ ساتھ خبریں بھی اِدھر اُدھر کرتا تھا بلکہ ہمارے خاندان میں تو اب تک ایسا ہوتا آرہا تھا کہ شادی کی خبر اور موت کی بریکنگ نیوز نائی ہی فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا اگر خبریں اِدھر اُدھر بریک کرنے کے تناظر میں دیکھا جائے تو عورت کے پیٹ میں بھی بات نہیں رہتی پھر کچھ عورتیں تو اتنی خوفناک ہوتی ہیں کہ وہ غصے میں بچوں کی حجامت سے بھی گریز نہیں کرتیں بلکہ بعضے تو شوہروں کو بھی بچوں سے کم نہیں سمجھتیں، ارے! میں حجامت کی ہی بات کررہا ہوں۔

دراصل کسی کی ٹھکائی لگانے کو بھی ہمارے ہاں حجامت کردینے کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ پھر یہ جو بیوٹی پارلر والیاں ہیں یہ بھی تو حجاموں کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ شکر ہے ہمارے دوست مَلک صاحب کی تسلی ہوگئی ورنہ وہ ہماری جان کو آجاتے ویسے آپس کی بات ہے ہم نے کچھ ناقابل تحریر زنانہ پروڈکٹس کے حوالوں سے بھی مَلک صاحب کو مطمئن کردیا ہے کہ وہ بھی اندر سے حجام ہی ہوتی ہیں۔ اب ہم آتے اس طرف کہ یہ اچانک بیٹھے بٹھائے ہمیں حجام کیوں یاد آگئے تو اس کی دو بڑی وجہ ہیں اول تو یہ کہ ہمارے خاندانی نائی نے استعفیٰ پیش کردیا ہے کہ وہ کراچی کے حالات کے سبب ہر شادی اور میت میں شرکت نہیں کرسکتا کیونکہ اس کی اپنی بھی شادی ہوگئی اور ابھی یہ مرنا نہیں چاہتا۔ دوم یہ کہ چین کا ایک ماہر حجام دونوں ہاتھوں سے بیک وقت حجامت بناسکتا ہے۔

یہ مہارت حاصل کرنے کے لیے چینی حجام نے کافی عرصہ سخت پریکٹس کی ہے۔ جس کے بعد نہ صرف دونوں ہاتھوں سے بلکہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی صرف پچاس سیکنڈ میں حجامت بناسکتا ہے۔ ہم نے چینی حجام کی تصویر بھی دیکھی ہے وہ بیک وقت دو آدمیوں کا سر ننگا کررہا ہے لیکن ہمیں اس کی اس مہارت پر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ ہم سیاسی حجاموں کے یہ کارنامے کئی سالوں سے دیکھ رہے کہ وہ کس طرح دونوں ہاتھوں سے عوام کی حجامت بنارہے ہیں اور اندھا دھند بنارہے ہیں۔ ہم ہیں کہ انہیں سرآنکھوں پر بٹھاتے ہیں، ان کے حق میں نعرے لگاتے ہیں اور پھر ان کے رخصت ہونے پر انتہائی عزت و احترام سے مٹھائیاں بھی تقسیم کرتے ہیں!!

محمد ظہیر قندیل

تماشہ میرے آگے

جاؤں تو کہاں جاؤں، عجب حال مرا ہے
ہڑتال مرے پیچھے ہے دھرنا مرے آگے
الزام تراشی ہے کہیں لاف زنی ہے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ہم جیسے چھڑے، جب ٹی وی دیکھیں تو کہتے ہیں، ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے۔ شادی شدہ جب بیوی دیکھیں تو کہتے ہیں، ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے۔ یہ تماشا آخر ہے کیا بلا؟ گھر میں بہن بھائی کسی کھیل میں لڑیں تو ماں ڈانٹتی ہے، کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ سکول میں استاد سے چند سوالات کرلیں تو پوچھتے ہیں کیا تماشا لگا رکھا ہے؟ مسجد میں بچے اگلی صفوں میں چلے جائیں تو مولانا کہتے ہیں، کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ گلی میں کرکٹ کھیلیں تو گھر سے نکالے ہوئے بزرگ بھی ڈانٹیں۔ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بڑوں نے کیا تماشا لگا رکھا ہے؟

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں۔۔۔ ہزاروں تماشے ہیں کیا کیا دکھاؤں

لوگ وقت گزارنے کے لیے تفریح ڈھونڈتے ہیں، تفریح ہمیں ڈھونڈتی ہے۔ ہم نے ہر چیز کو تفریح بلکہ تماشا بنا لیا۔ ہماری نظر میں سیاست تماشا، حکومت تماشا، عقیدت تماشا، ارادت تماشا، ریاضت تماشا، عبادت تماشا، اقامت تماشا، امامت تماشا، قیادت تماشا، عیادت تماشا، سخاوت تماشا، صحافت تماشا، شرافت تماشا، نجابت تماشا، ثقافت تماشا، سب تماشے بغیر ٹکٹ دیکھیے، دن میں ایک بار نہیں بار بار دیکھیے، ایک زمانہ تھا جب ہم دنیا کو حیرت سے دیکھتے تھے ماشاللہ اب پوری دنیا ہمیں حیرت سے دیکھتی ہیکہ ہمارے ہاں جو بیس کلو آٹے کا تھیلا نہیں اٹھا سکتے پورے ملک کی حفاظت کے لیے حلف اٹھا لیتے ہیں، قانون کے رکھوالے، قانون کو اپنی مرضی کے مطابق رکھ لیتے ہیں، ہم ایسی قوم ہیں اپنوں ہی کو دہشت گردی کا نشانہ بناتے ہیں، پھر ہم ہی احتجاج کرتے ہیں، اپنی ہی گاڑیوں کے شیشے توڑتے ہیں، اپنوں ہی کا سر پھوڑتے ہیں ،سڑک پر ٹائر جلاتے ہیں، اوبامہ کے پتلے بناتے ہیں، امریکا کو سرِ عام للکارتے ہیں اور پھر امریکن ایمبیسی کے سامنے ویزے کے لیے لائن میں لگ جاتے ہیں۔ اگر بے ایمانی، ڈھٹائی، سستی اور کاہلی میں نوبل پرائز دیے جاتے تو ہم سب سے زیادہ نوبل پرائز جیتنے والی قوم ہوتے۔ ہم تو ایسی قوم ہیں کہ خوراک سے لے کر دواؤں میں ملاوٹ کے باوجود زندہ ہیں۔ ہمارا کلچر شاہراہِ ولایت پر گم، عدالتوں سے انصاف ایک مدت سے گم، سیاست دانوں کی بصیرت مع بصارت گم۔ علما سے مذہب و شریعت گم، سائنس دانوں کا طبقہ امریکا و کینیڈا کی شہریت میں گم، ڈاکٹروں کا گروہ طلبِ دولت میں گم، مگر ہم زندہ قوم ہیں اور جی رہے ہیں اس سے بڑا کیا تماشا ہو؟

عوام الناس کو ایسے دبوچا ہے گرانی نے
کہ جیسے ''کیٹ'' کے پنجے میں کوئی ''ریٹ'' ہوتا ہے

ہمیں تو سادگی کا درس دیتا ہے وہی جس کے
بدن پر بیش قیمت سوٹ، سر پہ "ہیٹ" ہوتا ہے

صاحبِ صدر! غالب نے تو سڑی ماری تھی کہ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے۔ یہاں تو تماشے ہی تماشے ہیں اور ہم ہیں دوستو۔ اک طرفہ تماشا ہماری قومی زبان بھی ہے۔ اگر آپ پوری گرم جوشی کے ساتھ کسی کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے ساتھ قومی کا دم چھلا ٹانک دیجیے، لیجیے ذلت کی ابتدا ہوگئی، قومی کھیل ہاکی نے تو کب سے ہائے ہائے کی۔ قومی لباس پہننے والے کی جو عزت افزائی ایئر پورٹس، ہوٹلوں، سڑک پر گے ناکوں پر ہوتی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اسی ہال کا ہی حال دیکھ لیجیے، ہر شخص کو اپنی قوم پیاری مگر قومی لباس سے شرمساری، قومی جانور کے ہم خود شکاری، قومی کھیل میں ہمیں ملی خواری، قومی مشروب سے ہمیں ہے زاری، قومی ترانہ سننا ہماری سماعت پر بھاری، قومی زبان پر ضرب لگی سب سے کاری، جوار دو ہے وہ بھی اردو نہیں۔ اکیچوئلی میرے ڈیڈی ذرا اولڈ ایج کے ہیں سو ہی از اے ہٹ میڈ۔۔۔ اب اس نے پاگل تو ہونا ہی تھی اس جیسی اولاد کو پیدا کر کے۔ مگر افسوس کروں یا اپنے ترقی یافتہ ہونے پر ناز کروں، اک تماشا بنا کے رکھ دیا میری زبانِ شیریں کو ترقی کے اس خیال نے کہ آگے بڑھنے کے لیے صرف انگریزی ہی ضروری ہے۔ ان عقل کے اندھوں کو دکھائی نہیں دیتا کہ فرانس، چین، جرمنی، جاپان اور روس کوئی لولے لنگڑے ملک نہیں جنھوں نے اپنی ہی زبان کو فروغ دیا اور اسی میں ترقی پائی۔ ہم انگریز سے آزاد ہوئے، انگریزیت کے غلام ہو گئے، ہماری زبان انگریزی، آج کا جوان انگریزی، ہماری دکان انگریزی، دکان کا سارا سامان انگریزی، ہمارا لباس انگریزی، ہماری شان انگریزی، ہماری جان انگریزی، ہماری پہچان انگریزی، ہمارا ایقان انگریزی، ہمارا ایمان انگریزی، سارے کا سارا پاکستان انگریزی، مگر قومی زبان اردو، کتنی لہولہان اردو، اپنے وطن میں پریشان اردو۔ میرے وطن میں ہوتا ہے شب و روز یہی تماشا۔۔۔

کبھی پھر گفتگو ہو گی کہ یہ سوغاتِ افرنگی
عموماً آدمی کی ذہنیت کیسے بناتی ہے
ابھی اتنا کہے دیتا ہوں انگریزی کے بارے میں
کچھ ایسی ڈھیٹ ہے کم بخت آتی ہے نہ جاتی ہے

دوستو! ہوتا ہے شب روز تماشا فیس بک میں بھی۔۔ یہاں تماشا کیا۔۔ ہزاروں تماشے ہیں، پورے کا پورا خاندان آمنے سامنے بات نہیں کرتا۔ بس فیس بک پر اپ ڈیٹ کرتا ہے۔ بچہ گھر میں بیٹھا ہوتو اپ ڈیٹ کرتا ہے "آج طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے چھٹی کر لی۔" باپ کا کمنٹ آجاتا ہے۔ "ارے خبیث! آج سکول نہیں گیا" ٹیچر کی جانب سے اس کے باپ کے کمنٹ پر فوراً لائک کیا جاتا ہے۔ پرنسپل کا کمنٹ بھی آجاتا ہے۔ "درخواست پر کون سے والدِ محترم سے دستخط کروائے تھے؟" اگلے ہی لمحے ماں کا کمنٹ آجاتا ہے۔ "نالائق! اگر پڑھائی نہیں کرنی تھی تو مجھے سبزی ہی لا دیتا۔ تو ادھر فیس بک پر بیٹھ گیا ہے۔" اسی وقت دوست کا کمنٹ آجاتا ہے۔ "یجے! تو آتھی سی مووی ڈاؤن لوڈ کر۔۔۔ میں بھی آتا ہوں تیرے گھر ال کر دیکھیں گے۔" دوسرے دوست کا کمنٹ آجاتا ہے۔ "ابے! تو نے چھٹی کیسے لی؟" بچے نے اس کو جواب دیا "بس یار کہہ دیا دادی فوت ہو گئی ہیں۔" اسی وقت دادی کا کمنٹ بھی آ ٹپکا "لکھ لعنت۔۔ مینوں جوانی وچ ای مار دتا ای"۔

کہتے ہیں جسے فیس وہ بک ہو گیا کب سے
کھنے کو پری چہرہ ہیں صد ہا مرے آگے
حضرات نکلتے ہیں خواتین وکھیں جو
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

حماد احمد

تیتر بٹیر

ایک تھا تیتر، ایک بٹیر
لڑنے میں تھے دونوں شیر
لڑتے لڑتے ہو گئی گم
ایک کی چونچ اور ایک کی دم

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی طرف سے بچوں کے لئے لکھے گئے شعری مجموعے ''جھولنے'' کی یہ نظم معصوم بچہ درمیانی آواز میں گنگنا رہا تھا اور ساتھ ساتھ چھلانگیں بھی لگا رہا تھا۔۔۔ استاد بشیر متفکرانہ چہرہ لئے سامنے ہی موجود تھے۔۔۔ اس وقت وہ استاد بشیر کم اور استاد ''اقبال'' زیادہ معلوم ہو رہے تھے۔

اور گویا ہوئے:۔ ''یہ بتاؤ کہ ابھی جو نظم تم پڑھ رہے تھے، اس میں چونچ اور دم کے گم ہو جانے کے بعد کیا چیز وجود میں آئی؟''۔

۔''ظاہر ہے چونچ کٹے پرندے اور دم کٹے پرندے''۔ معصوم بچے نے اپنے ناقص علم کے مطابق جواب دیا تھا۔

۔''اچھا یہ بتاؤ کہ دونوں میں سے ایک کی چونچ اور دوسرے کی دم گم ہونے کا فائدہ سب سے زیادہ کس کو ہوا؟''۔ استاد بشیر نے اگلا سوال داغ دیا تھا۔

معصوم بچے نے کچھ دیر سوچ کے جواب دیا:۔ ''جی میرے خیال سے جس کی دم گم ہوئی تھی اس کو زیادہ فائدہ ہوا۔۔۔ کیونکہ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ کئی خواتین کی چادریں لمبی کی بجائے ''مزید لمبی'' یعنی ضرورت سے بھی زیادہ لمبی ہوتی ہیں اور جب وہ چلتی ہیں تو اپنی چادر کے ساتھ فرش کی صفائی بھی کرتی رہتی ہیں۔۔۔ جب ان کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے تو وہ درزی یا درزن کے پاس جا کے چادریں تھوڑی سی چھوٹی کروا لیتی ہیں مگر اس کام کے لئے درزی یا درزن کو پیسے بھی دینے پڑ جاتے ہیں۔۔۔ جس پرندے کی

کچھ دیر کی سوچ بچار اور غور وفکر کے بعد استاد بشیر کے چہرے سے پریشانی اور تفکرات کی شکنیں غائب ہو گئیں اور ان شکنوں کی بجائے اب استاد بشیر کا چہرہ تروتازہ معلوم ہو رہا تھا۔

معصوم بچے کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ضرور ''استادی دماغ'' میں کوئی نہ کوئی ''نئی سائنس'' معرض وجود میں آ گئی ہوگی۔

اچانک استاد بشیر نے معصوم بچے کو بازو سے پکڑ کر نیچے بٹھایا

ذم گم ہوگئی، وہ بھی چلتے چلتے اپنی دم سے فرش کی صفائی کرتا رہتا تھا۔۔اس کی ذم لڑائی میں خود بخود ہی کٹ گئی۔۔۔یوں اُس کے وہ پیسے بچ گئے جو اُس کو درزی سے اپنی دم چھوٹی کروانے کے لئے خرچ کرنا پڑتے"۔

فلسفہ ختم کرتے ہی معصوم بچے نے فاتحانہ سانس لیا اور قریب پڑی ہوئی ٹھنڈی سپرائٹ کو منہ سے لگا کر فتح کا جشن منانا شروع کردیا۔

مگر دوسری طرف استاد بشیر اپنی گردن کو نفی میں ہلا رہے تھے، جسے دیکھنے کے بعد معصوم بچے کا پریشان ہوتا چہرہ واضح طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔۔منظر بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کرکٹ میں باؤلر کسی کھلاڑی کو واضح طور پر ایل بی ڈبلیو آؤٹ کر دیتا ہے، مگر امپائر پھر بھی ناٹ آؤٹ قرار دے دیتا ہے اور باؤلر بیچارہ محض اپیل پر اپیل کرتا رہ جاتا ہے۔

۔"تو استاد جی، یہ سارا فلسفہ آپ خود ہی سمجھا دیں۔۔میری سمجھ میں تو جو دلائل آئے وہ میں نے آپ کو بتا دیے ہیں۔ویسے بھی اگر یہ دلائل زیادہ ضروری ہوتے تو صوفی غلام تبسم خود ان کو "جھولنے" میں شامل کر لیتے"۔معصوم بچے نے افسردگی کے عالم میں بولتے ہوئے احتجاج کرنے کی بھی معمولی سی کوشش کی تھی۔

۔"ہوں۔تو دھیان سے سنو، ان شاء اللہ میرے دلائل سے تمہاری ہر طرح تسلی ہو جائے گی"۔استاد بشیر نے معصوم بچے کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے اسے سمجھانا شروع کر دیا تھا۔حالانکہ معصوم بچہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ جب تک استاد جی کا سوال سامنے نہیں آیا تھا تب تک ہر طرح سے تسلی ہی تو تھی۔استاد بشیر نے خود ہی اپنا عجیب و غریب سوال بیچ میں لا کر بے سکونی پھیلائی ہے۔

"پہلے تو میں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ جس پرندے کی چونچ

ہوشیار باش

قطعہ باتصویر

ناخنِ عقل نہ لیں گے جو الیکشن میں عوام
دمِ تحریر جو ہوتا رہا ویسا ہو گا

ووٹ خونخوار درندوں کو اگر بھیڑیں دیں
سب کو معلوم ہے انجام جو اُن کا ہو گا

نوید ظفر کیانی

گم ہوئی تھی وہ تیتر تھا اور جس کی ذم گم ہوئی تھی وہ بٹیر تھا"۔استاد بشیر کا پہلی وضاحت کرنے کا انداز عجیب دوٹوک اور "آمرانہ" قسم کا تھا۔۔معصوم بچے نے بلا چوں چراں اثبات میں سر ہلایا تھا۔۔وہ استاد بشیر کے سامنے دوزانوں بیٹھا تھا۔۔چونکہ استاد بشیر کے ہاتھوں میں مولا بخش بھی موجود تھا اس لئے معصوم بچے کو نفی میں سر ہلا کر "ناٹ آؤٹ" قرار دینے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

دوسری طرف استاد بشیر نے اپنی بات جاری رکھی:۔"جیسا کہ میں نے ابھی بتایا کہ تیتر بیچارے کی چونچ گم ہوگئی تھی اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ چونچ شروع میں ہوتی ہے اس لئے تیتر کا شروع والا "ت" اُڑ گیا تھا۔۔۔جب تیتر کا ابتدائی "ت" اُڑ گیا تو باقی

''تیتر'' کی بجائے صرف ''یتر'' رہ گیا۔۔لیکن بیٹا یادرکھو کہ جدائی بہت بُری چیز ہوتی ہے۔۔''یتر'' میں موجود بیچاری ''ی'' کو بھی اپنے علیحدہ ہوجانے والے ساتھی یعنی شروع والی ''ت'' کی جدائی کا غم بہت ستارہا تھا۔۔۔اس لئے ''یتر'' میں درمیان والے ''ت'' اور ''ر'' نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہم دونوں ''ی'' کو اپنے درمیان میں بٹھا کے اس کا غم مشترکہ طور پر ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔یوں ''ی'' کے درمیان میں آنے کے بعد ''یتر'' تبدیل ہو کر ''تیر'' بن گیا۔جس کو انگریجی میں ایرو کہتے ہیں

بالکل اسی طرح دُم چونکہ آخر میں ہوتی ہے اس لئے دُم اُڑنے سے ''بٹیر'' کا ''ر'' اُڑ گیا۔۔اور باقی ''بٹیر'' کی بجائے صرف اور صرف ''بٹی'' رہ گیا۔

یہاں بھی ''ی'' کو اپنے علیحدہ ہوجانے والے ساتھی یعنی ''ر'' کی یاد نے بہت ستایا۔۔اس لئے ''ب'' اور ''ٹ'' نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ ہم ''ی'' کو اپنے درمیان میں بٹھا کر اس کی اشک شوئی کرتے ہیں اور اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔یوں ''بٹی'' تبدیل ہوکر ''بیٹ'' بن گیا جس کو اردو میں ''بلا'' کہتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ تیتر اور بٹیر کی لڑائی میں سب سے زیادہ فائدہ تیتر اور بٹیر دونوں کی ''ی'' کو ہُوا اور وہ بھی بہترین اور پیار محبت والے ساتھی مل جانے کی وجہ سے۔''

استاد بشیر کا فلسفہ ختم ہوتے ہی معصوم بچے نے ''جائے فلسفہ'' سے فرار ہونے کی کوشش کی تو استاد بشیر نے ایک مرتبہ پھر اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے:۔''تمہیں پتہ ہے کہ وہ چونچ اور دُم کٹے تیتر اور بٹیر کون ہیں اور اب کس شکل وصورت میں دکھائی دیتے ہیں؟''۔

۔''ن نن نہیں۔۔م مم مجھے کچھ نہیں پتہ''۔معصوم بچہ روہانسے انداز میں بولا تھا۔۔ویسے بھی وہ اوپر والا تفصیلی فلسفہ سن کر بری طرح بوکھلایا ہوا تھا اور مزید کچھ سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

۔''تیر (ایرو) چونکہ پیپلز پارٹی کا انتخابی نشان ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیتر کی چونچ غائب ہونے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو پیپلز پارٹی کی صورت میں تبدیل کرلیا۔دوسری طرف بیٹ (بلا) چونکہ تحریک انصاف کا انتخابی نشان ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بٹیر کی دُم علیحدہ ہونے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو تحریک انصاف کی شکل وصورت میں تبدیل کرلیا۔اور وہ دونوں چونچ اور دم کٹی ہونے کے بعد اب بھی ایک دوسرے سے باتوں باتوں میں کبھی کبھار لڑائی کرلیتے ہیں''۔استاد بشیر کو معصوم بچے کی حالت پر ترس آگیا اور انہوں نے دو لائنوں میں اپنے سوال کا جواب دے کر معصوم بچے کو ''جائے فلسفہ'' سے بھاگنے کا موقع دے دیا۔۔

اگلے سات سیکنڈز کے اندر اندر معصوم بچہ ہانپتا کانپتا صرف ''جائے فلسفہ'' سے ہی نہیں بلکہ گھر سے بھی فرار ہوچکا تھا۔

ٹیگ کرتے ہیں جنہیں پڑھتے تو ہوں گے وہ غریب
سارے اربابِ ادب' چاہے غزل جیسی بھی ہو
کوئی ردی کی نہیں ہے ٹوکری کہ فکر ہو!
پوسٹ ہوجاتی ہے اب چاہے غزل جیسی بھی ہو

نوید ظفر کیانی

نادر خان سر گروہ

شاعری سے ہماری دلچسپی اُس عمر میں ہی شروع ہو گئی تھی، جب دادی ماں کی نثری کہانیوں کا سلسلہ تھم گیا تھا اور جب سے ہم نے ٹرکوں کے پیچھے دوڑنا شروع کیا تھا۔ شومیِ قسمت کہ اُس وقت خدوخال ایسے نہ تھے کہ کوئی ہمارے ہاتھ میں شاعری کی کتاب تھماتا اور کہتا، ”خوش فہم اور حرف آشنا، نادر خان سَر گروہ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر“۔ اُن دنوں ہمیں اِس بات کا بھی علم نہ تھا کہ شاعری میں کون غالب ہے اور کس کا اقبال بلند ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا! ”شعر اور شاعر چھپائے نہیں چھپتے“۔ الغرض اشعار کہیں نہ کہیں سے ہمارے کانوں میں اور سَر پر پڑتے رہے۔ سب سے پہلا جو شعر ہم نے سنا، وہ یہ تھا:

پڑھو گے لکھو گے، بنو گے نواب
جو کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب

یہ شعر ہم جب بھی سنتے تھے، کان کھول کر سنتے تھے اور جس کان سے سنتے تھے اُسی سے نکال دیتے تھے۔ ہم یہ سوچتے تھے کہ اگر یہ شعر معنوی اعتبار سے صحیح ہے تو جتنے نواب گزرے ہیں، اگر پڑھ لکھ کر نواب بنے تھے تو پھر وہ شاعروں کو اشرفیوں کی پوٹلیاں دے دے کر کیوں پڑھواتے تھے؟ اور جب کھلاڑی کھیل کود کر خراب ہوتے ہیں تو اُن کو کِھلا کِھلا کر نوٹوں کی گڈِیاں اُن کے ہاتھ پر کس لیے رکھی جاتی ہیں؟ وہ گڈِیاں اُن کے منہ پر کیوں نہیں ماری جاتیں؟

خیر! بات ہو رہی تھی، اپنے کھیل کود کے دنوں کی اور خراب ہونے کی۔ اُن دنوں ہم نے شوقِ مطالعہ کے جوش میں بے شمار دکانوں کے سائن بورڈ، نرخ نامے اور ریستورانوں کے مینو پڑھ ڈالے تھے۔ مطالعہ کا شوق اور بڑھا تو راستوں کے اشتہارات اور دیواروں پر لکھی بچوں کی شرارت آمیز تحریریں پڑھنے لگے۔ بلکہ بعض اشتہارات اور تحریروں میں اپنے پلّے سے نقطے بڑھا گھٹا کر محظوظ بھی ہوتے رہے۔ پھر ذوق اور قد مزید بڑھا تو ٹرکوں کی پُشت پر لکھے اشعار پڑھنا شروع کر دیے۔ لیکن ٹرکوں کے مطالعہ سے پہلے ہمیں نوشتۂ ٹی شرٹ پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ ہم بڑے ذوق وشوق سے ٹی شرٹ پر لکھی مشکل سے مشکل تحریریں پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم ایک ٹی شرٹ پر ناہموار اور آپس میں گتھم گتھا تحریر پڑھنے میں منہمک تھے کہ ایک زوردار تھپڑ نے ہمیں اُس تحریر کے فسوں سے باہر نکالا اور بتایا، ”اَے قاریِ ناہنجار! خواتین بھی ٹی شرٹ پہنتی ہیں۔ تحریر پڑھنے سے پہلے ذرا پسِ تحریر بھی دیکھ لیا کر!“ وہ تھپڑ کیا تھا، ہماری توبہ تھی، ایسی توبہ جس میں گال ہمارا تھا اور ہاتھ کسی اور کا۔ اُس ایک گال والی توبہ نے ہم پر یہ راز بھی اِفشا کیا کہ کیا وجہ ہے جو...... ٹی شرٹ پر اشعار نہیں لکھے جاتے۔ ٹی شرٹ پر لکھے اشعار پڑھنے اور سمجھنے کے لیے نگاہ کا ایک جگہ ٹھہرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور جس پر نگاہ ٹھہری ہو اُس کا اپنے دونوں ہاتھ باندھے ایک جگہ ٹھہرنا اُس سے بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

دراصل شاعری کو عوام تک پہنچانے میں چھوٹے چھوٹے بالا خانوں کے بعد بڑے بڑے آوارہ ٹرکوں کا ہاتھ رہا ہے۔ بالا خانوں میں لوگ گاؤں گاؤں اور شہر شہر سے راہ بھٹک کر اشعار سننے آتے تھے، جب کہ ٹرک! گاؤں گاؤں اور شہر شہر، بھٹک بھٹک کر لوگوں کو اشعار پڑھواتے پھرتے ہیں۔ بالا خانوں میں شعر فہم حضرات آٹھوں پہر موجود رہتے تھے، اِس لیے وزن میں گڑبڑ کا امکان کم ہی ہوتا تھا (یاد رہے! شعر کے وزن کی بات ہو رہی ہے)۔ لیکن ٹرکوں پر لکھے اشعار میں بے شمار فنی اور تکنیکی خامیوں کی شکایتیں آئے دن موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اِس کی اہم وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی ٹرک ڈرائیور...... ڈرائیور ہونے کے ساتھ ساتھ عروضی میکانک نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے دوست پُر جوش پُوری کا خیال ہے کہ ڈرائیور کا شعر فہم ہونا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ وہ شعر کی 'تقطیع' میں اُلجھ کر راہ گیروں کی 'تقطیع' کرتا پھرے گا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ٹرکوں کے اشعار کے اَوزان میں گڑبڑ کا اہم سبب ہمارے ہاں کے اُوبڑ کھابڑ راستے ہیں۔ یوں بھی آڑے ترچھے، ہلتے ڈُلتے ٹرکوں پر نظر ٹکا کر اشعار پڑھنا، کوئی شعر کہنے جیسا آسان کام نہیں۔ اِس میں غلطی کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔ سارا اِلزام ٹرک والوں کی پشت پر ڈالنا ٹھیک نہیں۔ اور آپ کو پتا ہے؟ راستے پر ٹریفک کا اِتنا شور ہوتا ہے اور اُس پر ٹرک بھی پورا زور لگا کر طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہیں...... تو بتائیں! اِتنے غُل غپاڑے میں اشعار کیا خاک 'پڑھائی' دیں گے؟

پُر جوش پُوری کے پاس ہر سوال کا جواب ہوتا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ کہ اُن کا جواب کتنا صحیح ہوتا ہے۔ بہر حال، جواب ہوتا ضرور ہے۔ اُن سے جب ہم نے پوچھا کہ ٹرکوں کے پیچھے اشعار کیوں لکھے جاتے ہیں تو اُنہوں

نے بڑا ہی دلچسپ جواب دیا۔ وہ یہ کہ خراماں خراماں چلنے والے ٹرکوں کے پیچھے صبر کے ساتھ چلنے والوں کی دل جُوئی ہو اور اُن کا راستہ آرام سے کٹے۔

ہم نے کہا، ''پھر تو ٹرکوں پر پورا پورا دیوان لکھ دینا چاہیے۔ ایک شعر پڑھنے میں کیا وقت لگتا ہے۔ اب شروع ہوا اور اَب ختم۔'' پُوری جی ذرا خفگی سے بولے، ''نادر شاہ! تم کیسے سمجھو گے؟ بعض پڑھنے والے شعر صرف پڑھتے ہی نہیں، شعر کی تِکا بوٹی بھی کرتے ہیں، زمین دیکھتے ہیں، بحر دیکھتے ہیں، بحث کرتے ہیں۔ ایک شعر پر دس اشعار کی تہ جما دیتے ہیں۔'' ہم نے کہا، ''اس سے تو اچھا ہے کہ آدمی ٹرک چلائے، کیوں کہ ٹرک کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی منزل تک پہنچتا تو ہے، جب کہ بحث کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچتی۔'' وہ بولے ''کیسے نہیں پہنچتی نتیجے پر۔۔۔؟ جس کی لاٹھی اُس کی بحث۔''

ٹرک والوں کی دیکھا دیکھی اب چھوٹی گاڑی والے بھی اپنی پُشت پر اشعار کندہ کرنے لگے ہیں، لیکن وہ فقط چھوٹی بحروں والے ہی اشعار چنتے ہیں، طویل بحروں کو اُن کی پیٹھ کے دو کنارے اپنے اندر سما نہیں پاتے۔

ہم جو بچپن سے ٹرکوں کا مطالعہ کرتے آرہے ہیں، ایک اچھا خاصا تجربہ ہمیں اِس میں حاصل ہوا ہے۔ لیکن اَلمیہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو اَشعار کا ذخیرہ اکٹھا ہوا ہے، اُس میں مکمل اشعار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شعر نوٹ کرتے وقت ایسا اکثر ہوا ہے کہ ہم نے ابھی مصرع اُولیٰ نوٹ کیا نہیں کہ ٹرک نے دہاڑ ماری، دُھواں اُڑایا، نظروں سے اَوجھل ہوا......''اور ہم کھڑے کھڑے غُبار دیکھتے رہے۔'' نتیجہ یہ کہ ہمارے پاس مصرع ہائے اُولیٰ کی بھرمار ہوگئی۔ ہائے!

ٹرکوں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

ہم نے اُن لاوارث مصرعوں کو اُن کے حال پر چھوڑا اور آگے بڑھ کر 'ٹرکی ادب' پر تحقیق شروع کی تو چونکا دینے والے حقائق سامنے آئے۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک ٹرک کو روکا اور پوچھا، ''خان صاحب! ٹرک پر یہ شعر آپ نے کیوں لکھا ہے؟''

وہ متعجب ہو کر بولے، ''وَئی! کیا بکواس کرتی اَے! یہ شیر اَے؟''

''میں بکواس نہیں کرتی۔'' ہم نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ''میں بکواس کرتا ہوں۔'' وہ ہماری ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں سے نِوالے کی طرح پکڑ کر بولے، ''ناراااض کیوں اَوتی اَے۔ اَم تو سمجتا اَئے کہ یہ بیل بُوووٹا اَئے، نقش نگار اَئے۔''

ہم نے کہا، ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اُردو رسم الخط کو اَب لوگ نقش و نگار اور بیل بُوٹے ہی سمجھنے لگے ہیں۔''

ہمارے ایک ٹرانسپورٹر دوست ہیں، جن کا ٹرکوں کا دیوان ہے۔ اُن کے ہاں شام کو جب تمام ٹرک، محمود و ایاز کی طرح ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ بیت بازی کی محفل جمی ہے۔ ہم نے اُن سے پوچھا کہ بھئی

آپ شعر کے ساتھ شاعر کا نام کیوں نہیں لکھتے؟ تو کہنے لگے، ''لکھتے تھے بھئی! لکھتے تھے، لیکن اِس سے فتنہ جاگنے لگا۔ لوگ راستے میں ٹرک روک روک کر یہ بحث کرنے لگے کہ یہ شعر فلاں شاعر کا نہیں، فلاں کا ہے۔ بعض لوگ تو شعر کے اپنا ہونے کا دعویٰ بھی کر دیتے تھے۔ تو بھئی! ہم نے کہا، ختم کرو قصہ! مٹاؤ نام! نہ ہَڑ ہَڑ نہ بَڑ بَڑ۔'' ہم نے اُن سے بھی وہی سوال پوچھا، ''آپ ٹرکوں پر اشعار کیوں لکھتے ہیں؟'' وہ بولے، ''بس ایسے ہی۔ سب لکھتے ہیں تو ہم بھی لکھتے ہیں۔'' ہم بہت مایوس ہوئے کہ ہمارے اِس سوال کا جواب ٹرک والے ہی نہ دے سکے تو اَب کون دے گا؟

خیر! وجہ جو بھی ہو۔ ٹرکوں نے صرف دُھول ہی نہیں اُڑائی، شور ہی نہیں مچایا، بلکہ مشاعروں اور اَدبی محفلوں سے دُور بیٹھے عام آدمی تک شاعری کی مہک بھی پہنچائی ہے۔ نت نئے اشعار سے راہ چلتے، تھکے ہارے ذہنوں کو تازگی بخشی ہے۔

چلتے چلتے ہم آپ کو اپنے ٹرانسپورٹر دوست کے ٹرکوں کے دیوان سے منتخب اشعار کے ساتھ چھوڑے جا رہے ہیں، اِس اُمید کے ساتھ کہ آپ بحر نہیں دیکھیں گے، بحث نہیں کریں گے۔

ٹرک نمبر **MMZ- 2581 :**

نہ ملا ہے نہ ملے گا مجھے آرام کہیں
میں مسافر ہوں، مری صبح کہیں شام کہیں

ٹرک نمبر **MSE- 3617 :**

یہ بھی کیا بات ہے کہ مِلیں تو ہمیں مِلیں
اپنے نگر بُلاؤ، ہمارے نگر نہ آؤ

ٹرک نمبر **MMA-6283 :**

چلنے کو چل رہا ہوں، مگر جی اُچٹ گیا
آدھا سفر تو خاک اُڑانے میں کٹ گیا

ہوئے تیماردار جس کے

سید عارف مصطفیٰ

حیرت کی بات ہے کہ دنیائے طب کے محققین اپنی تحقیق زیادہ تر ادویات کی ساخت اور اثرات پہ جاری رکھتے ہیں لیکن نجانے یہ نکتہ ابھی تک انہیں کیوں نہ سوجھ سکا کہ جتنے بیمار کسی مرض کے سبب مرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ تیمارداروں کے ہاتھوں کھیت ہو رہتے ہیں اور چند مریضوں کی فوتیدگی کا استحقاق تو ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھی حاصل ہے ،، خوبرو نرسوں والے ہسپتالوں میں ایک ہی مریض کئی کئی بار بیمار ہو ہو کے داخل ہوئے جاتا ہے اور اپنے اقرباء واحباب کے "ذوق جمال" کی تسکین کیئے جاتا ہے،،، اور دوسرے کئی محروم لوگوں کا طبی و جمالیاتی استحصال ہوئے چلا جاتا ہے،،،

. ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ملازمین بار بار بیمار پڑنے اور ایسے دلکش امکانات سے پر ہسپتالوں کا رخ کرتے رہنے کو اپنی جاب ڈسکرپشن کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں، ایسے ہسپتالوں میں مریض عموماً گزرگاہوں کی طرف کروٹ کیئے لیٹے آنکھیں چمکاتے دکھائی دیتے ہیں، اسکے برعکس سرکاری علاج گاہوں میں مریض تیمارداروں کی آمد سے مایوس ہو کر دیواروں کی طرف کروٹ کیئے اپنی قسمت کو کوستے اور بڑبڑاتے پائے جاتے ہیں اور موقع ملتے ہی وہاں سے بغیر سلیپر پہنے نکل بھاگتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ لوگ ہسپتال میں اپنے چند خاص تیمارداروں کی آمد کے انتظار میں بھی اپنا قیام طویل کیئے جاتے ہیں، اگر وہ نہ آسکیں تو انکا نہ آسکنا اسقدر باعثِ رنج ہوتا ہے کہ مرض کی شدت بڑھ جاتی ہے،،، اگر آجاتے ہیں تو چہرے پہ سو قمقمے جل اٹھتے ہیں تاہم آ کر چلے جاتے ہیں تو انکا چہرہ خالی ڈرپ کی مانند ہو جاتا ہے اور " انکے " جانے کا دکھ انہیں اور بھی بیمار کیئے دیتا ہے۔

ہسپتالوں کی سب سے نمایاں خصوصیت انکی نرسیں ہوا کرتی ہیں۔ اُنکی دلداری نہ ہو تو بیشتر ہسپتال مریضوں سے خالی ہو کر ورکشاپوں میں ڈھل جائیں تاہم اِن میں تھوڑے بہت ڈاکٹر بھی ہوں تو کوئی حرج نہیں، اس سے نرسوں کا بھی دل لگا رہتا ہے... بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ مریضوں میں بھی نمایاں تبدیلی آئی ہے اور اب نرسوں کی ناز پروری کی لئے ترستے کئی مریض اب انکے خوبرو ہونے کی شرط بھی نہیں لگاتے، صرف قبول صورت ہونا بھی کافی رہتا ہے،،، بس مامتا نا جھلکنے کی احتیاط ہی لازمی ہے... ورنہ مریض خود کو گود میں بھر کر اٹھوانے کی ضد بھی کر سکتے ہیں،، اس کام کے لئے یوں تو وارڈ بوائے رکھے جاتے ہیں لیکن انکا زیادہ وقت نرسوں اور ڈاکٹرز روم پہ نظر رکھنے میں صرف ہو جاتا ہے۔

بعضے ہسپتالوں میں وارڈ بوائے نہیں ہوتے صرف ایسی نرسیں رکھ لی جاتیں ہیں کہ جن میں 90 فیصد وارڈ بوائے موجود ہوتا ہے اور ہر آن کود کے باہر آنے پہ تلا ہوتا ہے،،، ہاف آستینوں والی شرٹ سے جھلکتے انکے ورزشی بازو اور کسرتی ڈولے رنگین مزاج ڈاکٹروں اور سنگین انداز مریضوں ہر دو کو صراط مستقیم پہ گامزن رکھنے میں بہت مددگار ہوتے ہیں،،، مرد ڈاکٹروں کے ساتھ کام کرنے میں انہیں ویسے بھی کوئی جھجھک نہیں ہوتی کیونکہ ان ڈاکٹروں میں سے اکثر کے چکنے کلین شیو چہروں کے برعکس انکے چہرے پہ ہلکی ہلکی مونچھیں ہوتی ہیں اور وہ انکے مقابل شرمائے شرمائے بھی رہتے ہیں،، یہ بات بھی خاص ہے کہ ہسپتال کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو نرسوں کی تعداد مریضوں اور ڈاکٹروں سے کم ہی رکھی جاتی ہے ورنہ خدشہ رہتا ہے کہ وہ انہیں آپس میں برابر سے بانٹ سکتے ہیں،، تاہم بہت سے مریضوں کیلیئے چند ہی نرسوں کی دستیابی انکی آپسی رقابت میں ایسا معقول توازن پیدا کیئے رکھتی ہے کہ جس سے نرسوں کو ڈاکٹرز روم میں ستانے کے وافر مواقع مل پاتے ہیں۔۔۔

.

تیمارداروں کے حوالے سے یہ بات بہت اہم ہے کہ مریضوں سے ملنے کے لئے آنے والے بیشتر لوگ اسے کمال محبت سے وہ وہ اذیت پہنچاتے ہیں کہ اسکے سامنے مرض کی مردودانہ تکالیف ماند پڑ جاتی ہیں اور کئی تیمارداروں کے دل میں تو خیالِ تیمارداری ہی حضرت عزرائیل ڈالتے ہیں کہ انکا ابتدائی کام آسان ہوجائے۔ متعدد واقعات کی روشنی میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ تیمارداروں کی جانب سے تکالیف کی اس رسد مسلسل کے اجراء میں کبھی کبھی خود بیماروں کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے کیونکہ وہ ان میں سے چند کو تو خود ہی بار بار بلواتے ہیں، اسکی غایت یہ کہ انہیں کسی کندھے کے ساتھ لگ کر سکنے کی شدید جذباتی طلب رہتی ہے اور وہ "عین مطلوب" تیماردار اگر آ پہنچیں تو پھر انکے ساتھ محض مصافحے پہ ہی اکتفا کیوں کیا جائے، بسا اوقات تو بات معانقے پہ بھی نہیں رکتی... کہاں رکتی ہے، مہذب لوگ یہ کبھی نہیں دیکھ پاتے کیونکہ ذرا رنگینی یا سنگینی پہ انکی پلکیں خود بخود جھک جایا کرتی ہیں،،، پہلے پانچ دس منٹ کے بعد ایسے تیماردار اول اول تو مریض کے ساتھ بستر پہ ہی بیٹھ رہتے ہیں اور اگر ذرا موقع مل پائے تو دفعتاً وہیں لیٹ بھی جاتے ہیں، یوں تھوڑی ہی دیر میں مریض اور تیماردار کو الگ الگ پہچاننا بھی دشوار ہوجاتا ہے... بس یہی پہچان رہ جاتی ہے کہ مریض تو جاگتا پایا جاتا ہے اور تیماردار خوب پھنا کر سوتا ہے اور اسے ڈاکٹروں کی گشت ہی بیدار کراپاتی ہے،،،

ایک گھمبیر مسئلہ یہ بھی ہے کہ اکثر تیماردار مریض کی تکلیف کو اس بیمار سے زیادہ سمجھتے ہیں اور وہ مریض کو گاہے بہ گاہے بتاتے رہتے ہیں کہ اس وقت اسے کیسا لگ رہا ہوگا یا اس ناسمجھ کو کیسا محسوس کرنا چاہیئے،،، انہی راہبرانہ اوصاف کے سبب تیمارداروں کو مریض کی کسی بات کا یقین بھی کم ہی آتا ہے... مثلاً جب انکی جانب سے طبیعت پوچھنے پہ مریض کہے کہ "مرا جارہا ہوں، حالت بہت خراب ہے" تو انکی جانب سے ترنت تردید کی جائیگی، "ارے مرد بنو، اچھے بھلے ہی لگ رہے ہو بس ایسے ہی تھوڑا سا تو مسئلہ ہے"

جب طبیعت تھوڑی اور بگڑ جائے تو تیمارداری کے وعظ میں تقابلی جائزہ بھی در آتا ہے "میاں ناشکری نہ کرو، ایک ذرا کی ذرا میں پریشان ہوکر ہمت ہار رہے ہو، ذرا اوروں کی طرف دیکھو، کتنے لوگ کیسے کیسے امراض میں کتنے ہی برسوں سے مبتلا ہیں...!"

اور اگر شومئی قسمت بیماری کی شدت کے حق میں ساری رپورٹیں ہی چیخ پڑیں تو تیماردار ایک اور پہلو سے آگے بڑھتے ہیں،،،

"میاں یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے،،، اتنی اور اسقدر بے احتیاطیوں کے بعد یہ تو ہونا ہی تھا... یہ سارا بگاڑ تمہاری غفلتوں کا ہی نتیجہ ہے...!!"

ایسے تیماردار وقفے وقفے سے مریض کو کبھی گھرکتے اور کبھی سہلاتے رہتے ہیں لگتا ہے کہ ان سے بڑا مریض کا خیرخواہ کوئی نہیں، لیکن انکی یہ لن ترانیاں اکثر اس وقت بھی جاری رہتی ہیں کہ جب انکا مریض سونے کیلیئے بیتاب ہورہا ہوتا ہے،،، وہ عام طور پہ محفل پسند ہوتے ہیں اسلیئے اوروں کے تیمارداروں کو بھی وہیں بلا لیتے ہیں اور پھر خوب خوب محفل جماتے ہیں... ایسے میں شریف سے شریف مریض بھی آنکھوں میں ننگی گالیاں دیتے محسوس ہوتے ہیں،، آخر ہسپتالوں میں کئی مریض یونہی تو نہیں خود کو مار

بیٹھتے،،،اور اسکے لیئے کبھی کبھی ڈاکٹر قصوروار نہیں بھی ہوتے...

چند برس پہلے جب میر یہرنیا کیمعمولی سے آپریشن کی نوبت آئی تو مجھے بھی بھانت بھانت کے تیمارداروں سے دوچار ہونا پڑا... اِن میں سے بیشتر کے اندازِ پرسش جدا تھے، لیکن اسلوبِ تفتیش خاصے تھانیدارانہ،،، مجھے کئی کئی بار ایک ہی بیان کو نئے سرے سے دہرانا پڑتا تھا... نامناسب نہ ہوتا تو اسکی تفصیل ایک تختی پر لکھ کر گلے میں لٹکا رکھتا،،، لیکن خدشہ تھا کہ ناآشناؤں میں سے کوئی پیسے نہ ڈال جائے،،، میری ایک ہی بیان پہ قائم رہنے کے باوجود چند ایک کے تاثرات میں بے یقینی صاف جھلکتی تھی،، گویا میرے ہرنیا کی شاخیں کسی اور رنگینیٔ کرتوت کے چمنستان میں جھولتی ہیں،،، دو ایک کی تو تشفی نہ ہوئی اور بڑھکر ڈاکٹر سے اصل مرض اور اسکی وجہ پوچھ ہی لی لیکن ڈاکٹر کے جواب نے تو معاملے کو اور مشکوک بنادیا،،، کیونکہ اس نے انہیں یہ بتایا کہ "ہرنیا زیادہ بوجھ اٹھانے یا زیادہ زور لگانے سے بھی ہوجاتا ہے..."اس پہ انکے چہروں پہ یکا یک جو لالی آئی وہ گویا میرے اعتماد کے خون سیے آمد ہوئی تھی... صاف لگتا تھا کہ ڈاکٹر کے جواب کے پہلے حصے یعنی زیادہ بوجھ اٹھانیوالی بات پہ انکی توجہ مطلق نہیں ہے... اور ابھی تک مشقِ سخن ایسی "زورا زوری" کے زمرے میں نہیں گنی جاتی،،

.تیمارداروں کا ایک تجسسی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مریض کے آپریشن والے مقام کو بچشم خود ملاحظہ کرنے کے بہت شائق ہوتے ہیں، اگر آپریشن کسی "ایسی ویسی" جگہ کے نزدیک ہو تو ذوقِ معائنہ اور بھی بڑھ جاتا ہے، مریض جتنا بھی دکھا پائے تیماردار کی طبیعت میں سیری نہیں ہوتی، نگاہیں اسکے ورے اور پرے ہی متلاشی رہتی ہیں،،

یہ سمجھنا زیادتی ہوگی کہ سبھی تیماردار ایک جیسے ہوتے ہیں،، درحقیقت تیماردار کئی طرح کے ہوتے ہیں اور سب کے اپنے اپنے انداز ہیں اور وہ بھی ایک سے بڑھکر ایک،،، بھیا نک،، ایک ملنے والے تو بڑے ہشاش بشاش تھے لیکن تھوڑی ہی دیر میں انہیں کچھ یاد آگیا،،،

"ارے اسی کمرے اس بیڈ پہ تو میرا دوست سرفراز بھی داخل تھا...! دو سال پہلے میں یہیں تو اُس سے ملنے آتا تھا،،، اسے بھی ہرنیا ہی کا مسئلہ تھا،،،"

اچھا"... میں نے بات آگے بڑھائی اور پوچھا کہ "پھر کیسا رہا انکا آپریشن... زیادہ تکلیف تو نہیں ہوئی تھی،،،؟"

"نہیں آپریشن کی نوبت ہی نہیں آئی،،،!!"

میری دل میں نجانے کتنی آشاؤں کے دیپ جل اٹھے......

میں نے اپنی آواز سے بمشکل مسرت آمیز کپکپاہٹ کو دور کیا،،،"

.تو کیا اسکے بغیر ہی ٹریٹمنٹ ممکن ہوگیا تھا،،،؟""

.

"نہیں.. (انہوں نے بستر پہ تاسف انگیز نظر ڈالی)... اسکا ہرنیا پھٹ گیا تھا اور اسکا یہیں انتقال ہوگیا تھا..."!!

پھر اس بستر پہ ہمارا مزید ٹھہرے رہنا کسی مجاہدے سے کم ہرگز نہ ثابت ہوا،،

ایک ہمدرد تو ایسے بھی تھے کہ ملنے کے اوقات کے بعد آئے اور اندر آتے ہوئے نرس کے روکنے پر لہجے میں بہت تشویش بھرلائے،،،،

."بڑی دور سے اور بڑی مشکل سے آیا ہوں پلیز مجھے ملنے دیں، کیا پتا اسکے بعد یہ موقع پھر ملے کہ نہ ملے،،،!"

چند تیماردار وقفے وقفے سے مریض کے سرہانے بیٹھ کر کچھ نہ کچھ پڑھنے اور لمبی لمبی پھونکیں مارنے پہ بھی تلے رہتے ہیں جس سے اِس تمام وقت مریض کی گھگھی بندھی رہتی ہے،،، گھگھی بندھنے میں دیر لگے تو روحانیت کو عروج پہ پہنچانے اور فوری تاثیر کیلیئے میت وسوئم والی اگربتی بھی سلگا لی جاتی ہے جس وہ شامت کا مارا دنیا کے بجائے ہسپتال سے فوری فراغت کے لئے پکار اٹھتا ہے تس پہ وہ پھونک مار ہستی اِس عاجلانا دستبرداری کو اپنی روحانیت کا اعجاز باور کراتی ہے

کچھ ملاقاتی مریض کی غذا کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اسکے پاس بیٹھ کر بڑی مستعدی سے دوسروں کے لائے پھلوں کی قاشیں بنائے جاتے ہیں اور ہر چار چھ قاشوں میں سے ایک آدھ مریض کو کھلانا نہیں بھولتے،،، گاہے گاہے مریض کو چھینکیں بھی آتی رہتی ہیں کیونکہ اکثر اِس ہمدرد کی توجہ الہڑ نرس پہ گہری ہوجاتی ہے.. اور نادانستگی میں قاشوں کا رخ مریض کے منہ کی

بجائے اسکی ناک کی طرف ہو ہو جاتا ہے،،، بعضے تیماردار ایسے ہوتے ہیں کہ گویا دائم، حالت تشویش میں رہنا پسند کرتے ہیں ہر چند کہ ہمارے ڈاکٹر نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ "پریشانی والی کوئی بات نہیں، لیکن لگتا تھا کہ ہماری اس تسلی بخش کیفیت سے انکے تشویشی جذبات سراسر مجروح ہوئے ہیں، اور وہ زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ "یہ کیا بات ہوئی بھلا"،،، یا یہ کہ "اصل بات کچھ اور ہی ہے"،،،!!

مریضوں کی بابت یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سبھی مریض بدنظر نہیں ہوتے، چند زیادہ بدنظر بھی ہوتے ہیں اور انکا التفات محض اپنے مہمانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ اسکے دائرے میں نرسوں کے علاوہ اردگرد کے کئی بیماروں کے ملنے والے بھی آتے رہتے ہیں، جن کا دل جیتنے کیلیئے عموماً" وہ ماکولات و مشروبات اور غذائی رسد فوری کام آتی ہیں کہ جنہیں وہ اپنے ندیدے تیمارداروں سے جیسے تیسے بچا پاتا ہے... اپنی ان خوش خلق کارروائیوں میں وہ مریض بسا اوقات اپنے ساتھ ٹھہرائے گئے اٹینڈینٹ کو بھی شریک کر لیے ہیں اور یوں مشترکہ اتحاد سیو ہیں کئی قلعے سر کر لیئے جاتے ہیں... اس قسم کی خوش اخلاقیاں مآل کار اپنا رنگ دکھاتی ہیں اور کئی گھرانوں کے مابین نئے رشتوں کے امکانات پیدا کرتی ہیں.. کبھی کبھی تو مریض اور اسکی کوئی نرس بھی ہسپتال سے ساتھ ہی فراغت پا جاتے ہیں،،، اسی طرح کسی مریض سے اگر کوئی ملنے بار بار آرہا ہے تو قطعی لازمی نہیں کہ اسکی وجہ مریض کیساتھ کوئی پرانا تعلق ہو،،، یہ کوئی نیا تعلق بھی ہوسکتا ہے اور مریض کے سوا بھی ہوسکتا ہے،،، عموماً ایسا شک کرنا نہیں چاہیئے کیونکہ ذرا سا کریدنے پہ بات بھی سچ نکلتی ہے اور آگے کیمراحل میں مدد بھی فراہم کرنی پڑ جاتی ہے---

ہسپتال میں چند روز گزارنے اور متعدد دیگر ایسی مثالوں پہ غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اگر ہسپتال میں داخل کسی پیارے کی جلد صحتیابی مطلوب ہے تو پرہیز پہ خاص توجہ دیجیئے لیکن یہ پرہیز کھانے پینے سے زیادہ تیمارداروں سے ہونا چاہیئے، کسی سر جھاڑ منہ پھاڑ ٹائپ بوسیدہ سی بقراطی نرسوں والے ہسپتال کا انتخاب کر لیں تو کیا کہنے، مریض خود بھی جلد از جلد صحتیابی کیلیئے اتاؤلا ہوگا اور تیمارداروں کا ریلا بھی ادھر کا رخ کرنے سے گریز کرے گا،، اسپتال کے اخراجات میں خاطر خواہ کمی کا فائدہ الگ ہوگا۔

مرجعِ اہلِ نظر ہے ارمغانِ ابتسام
نخلِ دانش کا ثمر ہے ارمغانِ ابتسام

اس کے مندرجات ہیں آئینۂ نقد و نظر
افتخارِ دیدہ ور ہے ارمغانِ ابتسام

ہوتی ہیں اس میں تبسم ریز ادبی کاوشیں
مثلِ گوہر جلوہ گر ہے ارمغانِ ابتسام

ہے یہ سہ ماہی مجلّہ ناشرِ طنز و مزاح
ہر خبر سے باخبر ہے ارمغانِ ابتسام

ہے یہ نظم و نثر کا خوش رنگ گنجِ شایگاں
نازشِ اہلِ نظر ہے ارمغانِ ابتسام

ہے یہ برقی اعظمی اک منبعِ طنز و مزاح
مظہرِ عزمِ ظفر ہے ارمغانِ ابتسام

احمد علی برقی اعظمی

میاں افتخار رشید

مطالعۂ نیا پاکستان

نیا پاکستان اگست 2014 میں قائد اعظم ثانی کپتان خان کی قیادت میں قائم ہوا۔ نیا پاکستان اسی روز وجود میں آ گیا تھا جس روز پرانے پاکستان نے پہلا ورلڈ کپ جیتا تھا۔ قائد اعظم ثانی کپتان خان کی ان تھک محنت اور لگن کی وجہ سے پرانے پاکستان کے بلے برداروں کو شریف خاندان کی غلامی سے نجات ملی اور آج وہ آزادی سے ہر طرف انقلاب برپا کرتے پھرتے ہیں۔ نئے پاکستان کا خواب حکیم البشارات علامہ طاہر القادری نے دیکھا اور خطبہ ماڈل ٹاون میں پہلی بار نئے پاکستان کے قیام کا تصور دیا۔ تفصیل سے پڑھیے

''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ماڈل ٹاون، زمان پارک اور خیبر پختونخواہ آزاد اور خودمختار اکائیوں کے طور پر شریف تسلط میں یا اس سے باہر ایک جداگانہ وجود قائم کر سکتے ہیں۔''

دوقومی نظریہ

پرانے پاکستان میں شروع ہی سے دو قومیں مسلم لیگ (ن) اور تحریک انصاف بستی تھیں جن کے نعرے، مطالبات، رہنما، فیس بک اکاونٹ اور انتخابی نشان سب ایک دوسرے سے علیحدہ تھے۔ ایک گروہ جو مسلم لیگ (ن) میں شامل تھا اور شیر پر مہریں لگاتے تھے اور دوسرے تحریک انصاف کے نوجوان جو بلے سے شیر کا شکار کیا کرتے تھے۔ مسلم لیگ (ن) نے اپنے اکثریتی ووٹوں اور نشستوں کی بنیاد پر تحریک انصاف کو غلام بنانے کی کوشش کی ، تاہم طالبان خان رحمتہ اللہ علیہ نے علامہ طاہر القادری کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے اپنی

جدوجہد کا آغاز کیا اور تحریک انصاف کو آزادی دلائی۔

تحریک مقاطعہ انتخابات

2007 میں وائسرائے پرویز مشرف کے دور میں ہونے والے انتخابات کے دوران تحریک انصاف اور مسلم لیگ (ن) نے مل کر انتخابات کے مقاطعہ کی تحریک چلائی۔ نواز شریف نے تحریک انصاف کو کاغذات نامزدگی جمع کرانے سے منع کیا اور جمع کرائی گئی نامزدگیاں واپس لیتے ہوئے انتخابات کا مقاطعہ کرنے کی ہدایت کی جس کے بعد تحریک انصاف کے ہزاروں امیدوار اپنے کاغذات جمع کرائے بغیر انتخابات سے باہر ہو گئے۔

سانحہ ماڈل ٹاؤن

ماڈل ٹاؤن میں منہاج القرآن کے نہتے معصوم طالب علموں پر گولیاں چلا کر سینکڑوں معصوم طالب علموں، بچوں اور عورتوں کو شہید کر دیا گیا، جس کے بعد کنٹینرز لگا کر پورے ماڈل ٹاؤن کو بند کر دیا گیا۔

مسلم لیگی وزارتیں

مسلم لیگ (ن) 2013 کے انتخابات میں تحریک پاکستان کو دھاندلی سے شکست دے کر حکومت میں آئی، مسلم لیگ (ن) کی حکومت کے دوران تحریک انصاف کے کارکنوں کے جلسوں کے دوران حکومت ناچ گانے کے مفت پروگرام منعقد کرتی رہی جس سے انقلابی سرگرمیاں متاثر ہوئیں اور تحریک انصاف کے کارکنوں کو زبردستی ٹیکس اور بجلی کے بل دینے پر مجبور کیا جاتا رہا اور پٹرول پمپ بند کر کے انقلابی موٹر سائیکلوں کو روکنے کی کوشش کی گئی، تاہم انقلابی نوجوانوں نے فیس بک پر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

انتخابات 2013 میں دھاندلی کے ثبوت

مفروض اے سازشی کی تحقیق کے مطابق انتخابی دھاندلی کے درج ذیل ثبوت سامنے آچکے ہیں:

1۔ انتخابات 2013 کے دوران پچیس کروڑ عید مبارک والے جعلی بیلٹ پیپر چھاپے گئے۔

2۔ اتفاق فاؤنڈری کی فولادی بھٹی میں ربڑ کی ایسی مہریں بنائی گئیں جن کے نشان صرف شیر والے ووٹوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔

3۔ مسلم لیگ (ن) کے پاس ہر حلقہ میں پانچ سوا پسے گلو بٹ اور پانچ سوا پسے پومی بٹ تھے جن کے ہر ہاتھ میں انگلیوں کی بجائے پانچ پانچ انگوٹھے تھے، یہی وجہ ہے کہ انگوٹھوں کے نشانات کی تصدیق نہیں ہو سکتی۔

4۔ جن حلقوں میں تحریک انصاف کے امیدوار کھڑے نہیں ہوئے وہاں بیلٹ پیپر پر تحریک انصاف کا انتخابی نشان "بلا" جان بوجھ کر نہیں چھاپا گیا، جس سے تحریک انصاف ڈیڑھ سے زائد حلقوں میں جیت نہیں سکی۔

5۔ دھاندلی کے اصل ذمہ دار بالی ووڈ کے ایجنٹ راحت فتح علی خان ہیں، جنھوں نے مسلم لیگ (ن) کا انتخابی ترانہ تحریک انصاف کے انتخابی گیت سے بہتر گایا، انہیں اس کی کڑی سزا دی جانی چاہیے۔

6۔ انتخابات کے دوران جو مقناطیسی سیاہی استعمال کی گئی اس میں حمزہ شہباز کی نگرانی میں ایسے مقناطیسی ذرات استعمال کیے گئے جو شمالاً جنوباً کی بجائے شرقاً غرباً مقناطیسی میدان بناتے ہیں۔ (دیکھیے جنرل سائنس لازمی، باب ۳؛ نواز شریف کا مقناطیسی میدان)

دھاندلی کا طریقہ کار

ووٹوں کی گنتی کے دوران ٹھیک پانچ بج کر پندرہ منٹ پر پاکستان بھر میں تحریک انصاف کے تمام پولنگ ایجنٹ جب تین منٹ کے لیے پیشاب کرنے گئے تو ہر حلقہ کے گلو بٹ اور پومی بٹ نے تمام بیلٹ باکسز میں عید مبارک والے جعلی نوٹوں پر اتفاق فاؤنڈری میں تیار کی گئی مہروں سے جعلی مقناطیسی سیاہی کے نشانات لگا کر مسلم لیگ (ن) کو جتا دیا۔ پتہ چلانا چاہیے کہ پانچ بج کر پندرہ منٹ پر تحریک انصاف کے تمام پولنگ ایجنٹ اکٹھے پیشاب کرنے کیوں بھیج دیے گئے۔ انتخابات کے دوران ایسے ریٹرننگ افسر تعینات کیے گئے جنہیں سو سے آگے گنتی نہیں آتی تھی، اس لیے انہوں نے اندازے سے ووٹ گنے بغیر نتائج لکھے۔

قرارداد نیا پاکستان

نئے پاکستان کی قرارداد طاہر القادری پارک جسے پہلے زمان

پارک کہا جاتا تھا، میں منظور کی گئی۔ آج اس جگہ مینار نیا پاکستان قائم ہے اور حقیقی آزادی اور نئے پاکستان کی یاد دلا رہا ہے۔ قرارداد شیرِ بغاوت جاوید ہاشمی نے پیش کی جس کی تائید شاہ محمود قریشی، محمود الرشید اور شفقت محمود نے کی۔

تحریک نیا پاکستان

تحریک نیا پاکستان کا آغاز ماڈل ٹاون اور زمان پارک سے دوپہر تین بجے ہوا جو 40 گھنٹے میں اسلام آباد پہنچی۔ شریف حکم رانوں کے ظلم کی وجہ سے ایک لاکھ میں سے ننانوے ہزار نو سات سو پچاس موٹر سائیکل پنکچر ہو گئے۔ احتجاج سے خوفزدہ ہو کر حکومت نے دس لاکھ انقلابیوں میں سے نو لاکھ پچاس ہزار گرفتار کر لئے جس کے باوجود اسلام آباد میں دس لاکھ میں سے نو لاکھ انقلابی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، جن کا ساتھ دینے کو خیبر پختونخواہ سے ساٹھ ہزار انقلابی نیا پاکستان بنانے کو پہنچ گئے جس کے بعد انقلابی مجمع کی کل تعداد بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ انقلابی مارچ نے اسلام آباد میں دھرنا دیا جہاں قائد اعظم ثانی نے موسم کی سختیاں اپنے کارکنان کے ساتھ برداشت کیں اور بالآخر ریڈ زون میں داخل ہونے تک حکومتی ظلم کے باعث صرف پانچ ہزار کارکن پارلیمان کے سامنے پہنچ پائے۔

اسی دوران مفکر نیا پاکستان حکیم البشارات علامہ طاہر القادری کے انقلاب مارچ نے آزادی مارچ کے ساتھ جدوجہد کا آغاز کر دیا جس سے شریف خاندان کی حکومت ختم کرنے اور نیا پاکستان بنانے میں مدد ملی۔

قائد اعظم ثانی نے پاکستان بننے سے پہلے پہلی انقلاب ساز اسمبلی سے اپنے سوشل میڈیا پیغام میں کہا؛

"آپ کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہو، مسلم لیگ (ن) سے ہو، ایم کیو ایم، جماعت اسلامی یا کسی بھی سیاسی جماعت سے ہو، آپ آزاد ہیں کہ آپ تیر، شیر، لالٹین، کتاب یا پتنگ کسی بھی نشان پر مہر لگانے یا کسی کے حق میں بھی ٹویٹ کریں، ریاست کا سیاست اور انتخابات سے کوئی تعلق نہیں۔"

نیا پاکستان بنانے کے لئے دن رات کنٹینر پر سونے، بارش میں بھیگنے اور مسلسل تقریریں کرنے کی وجہ قائد اعظم ثانی کپتان خان کی طبیعت ناساز رہنے لگی جس کی وجہ سے انہیں ڈاکٹروں کے مشورے سے بنی گالہ منتقل کر دیا گیا جہاں مادر ملت شیریں مزاری نے ان کی دیکھ بھال اور ان کے فیسبک ٹویٹر اکاونٹ پر کارکنان سے رابطے کا عمل جاری رکھا۔ طبیعت بہتر ہونے پر وہ اپنے آبائی علاقہ زمان پارک منتقل ہو گئے اور وفات پانے تک سیلفیز پوسٹ کرتے رہے۔ ایک صبح طبیعت اچانک بگڑنے پر انہیں ایمبولینس کے ذریعہ شوکت خانم ہسپتال منتقل کرنے کے لئے لے جایا جا رہا تھا کہ راستے میں میٹرو بس کی گزرگاہ کے قریب عطااللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز میں نئے پاکستان کا قومی ترانہ "جب آئے گا کپتان خان بنے گا نیا پاکستان" سنتے ہوئے ایمبولینس خراب ہونے سے وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ کپتان خان کی آخری ٹویٹ "نیا پاکستان۔ انقلاب" تھی، ان کی نماز جنازہ مولانا طارق جمیل نے رائیونڈ میں ادا کی جس کے بعد قائد ملت شاہ محمود قریشی نے حکومت سنبھالی۔ آپ کا مزار اسلام آباد ڈی چوک پر کھڑے ایک کنٹینر میں ہے۔

مصنف کے بلاگ "بیاضِ انتظار" میں یہ مضمون موجود ہے۔

ساغر نظامی کی بہن بھی شاعرہ تھیں اور مینا تخلص رکھتی تھیں۔ ماجد حیدرآبادی سے چونکہ ساغر صاحب کی چشمکیں چلتی رہتی تھیں اس لئے ساغر صاحب مشاعرے میں اس شرط پر جاتے تھے کہ ماجد صاحب کو نہیں بلایا جائے گا۔ ایک مشاعرے میں صدارت ساغر نظامی کی تھی۔ چونکہ ماجد صاحب مدعو نہیں تھے اس لئے وہ مشاعرہ سننے کے لئے سامعین میں آ کر بیٹھ گئے۔ لوگوں کو جب پتہ چلا تو سب نے شور مچا دیا کہ ماجد صاحب کو ضرور سنیں گے اور مجبوراً منتظمین کو ماجد صاحب کو دعوت سخن دینی پڑی۔ ماجد صاحب مائک پر آئے تو کہنے لگے کہ چونکہ مجھے مدعو نہیں کیا گیا تھا اس لئے کوئی غزل ساتھ نہیں ہے البتہ دو شعر فی البدیہہ کہے ہیں جناب صدر اجازت دیں تو پیش کروں۔ اجازت ملنے پر یہ دو شعر سنائے

پھر آ گیا ہے لوگو! برسات کا مہینا
لازم ہوا ہے اب تو سب کو شراب پینا
پہنچا جو میکدے میں حیران رہ گیا میں
الٹا پڑا تھا ساغر اوندھی پڑی تھی مینا

سکندر حیات بابا

کیڑا تو پھر کیڑا ہوتا ہے

تو مہربان صاحبان قدردان آج ہم آپ کو چند کیڑوں کے متعلق بتانے والے ہیں، یہ ہرگز وہ رینگنے یا اڑنے والے کیڑے نہیں جن کی لاکھوں اقسام پائی جاتی ہیں اور سینکڑوں نئی قسمیں ہر سال مزید دریافت ہوتی ہیں،

یہ کیڑے وہ ہیں جو اشرف المخلوق انسان صاحب میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے کچھ تو ہزاروں سال پہلے کے ہیں جو کہ ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے بتدریج اب زیادہ سمارٹ ہوگئے ہیں، جبکہ کچھ کیڑے جدید بھی ہیں جو حال ہی میں دریافت ہوئے، کل ملا کر دیکھا جائے تو حضرت انسان کی تمام تر شر پسندی کا باعث یہ قدیم اور جدید کیڑے ہی ہیں،

چلئے کیڑوں کی چند ایسی ہی اقسام کے بارے میں بات کرتے ہیں:

سیاسی کیڑا

یہ کیڑا قبل از مسیح بھی انسان میں پایا جاتا تھا بلکہ اس کیڑے کی موجودگی کے شواہد تقریباً سوا پانچ ہزار پہلے وزیر اعلی سندھ قائم علی شاہ کے زمانہ پیدائش میں بھی ملتے ہیں، مختلف ادوار میں اس کیڑے نے خوب گل کھلائے، کئی نامور بادشاہوں کا تخت الٹا، پگڑیاں اچھالی اور سر نیزوں پر چڑھائے، سیاسی کیڑا کافی سیانا ہوتا ہے، اسکی تشخیص جتنی آسان ہوتی ہے علاج اتنا ہی مشکل، نرم گرم کرسی اس کیڑے کی شدید خواہش ہوتی ہے، اور اس خواہش کے ہاتھوں مجبور ہوکر یہ بندے سے وہ کام کرواتا ہے کہ بندہ بندے کا پتہ ہی نہیں لگتا، یہ کیڑا ہزاروں سال کے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آج بہت ہی زیادہ خطرناک صورت اختیار کرگیا ہے، یہ کیڑا خواص میں جتنا عام ہوتا ہے عوام میں اتنا ہی خاص ہوا کرتا ہے، عوامی خاص کیڑے کی دلچسپ کارستانیوں کے بخوبی مشاہدے کیلئے سوشل میڈیا کا کوئی بھی پلیٹ فارم ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے،

انتہا پسند کیڑا

انسان جتنا پرانا ہے اس کیڑے کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے، اس کیڑے کے کاٹنے سے انسان میں اپنی سوچ زبردستی دوسروں پر مسلط کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے، اگرچہ یہ کیڑا مذہبی لوگوں کیلئے خاص سمجھا جاتا ہے لیکن تاریخ کے گہرے مطالعے اور جدید دور کے مذہب بیزار لوگوں کے قریبی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیڑا انہیں زیادہ پریشان کرتا ہے،

رینگ کیڑا

یہ کیڑا مکمل طور پر جدید دور کی دریافت تو نہیں لیکن اس کیڑے نے پہیے کی ایجاد کے بعد سر اٹھانا شروع کیا، یہ ان چند

نایاب کیڑوں میں سے ایک ہے جو انسان کے سر دل و دماغ میں نہیں بلکہ ایک نا قابل اشاعت و نا قابل بیان جگہ پایا جاتا ہے، یہ کیڑا خاص طور پر تب ایکٹویٹ ہوتا ہے جب کوئی موٹر سائکل کی سیٹ پر تشریف فرما ہو، اسی ریسنگ کیڑے کے سبب صرف لاہور میں آٹھ ماہ کے دوران کوئی ستر کے قریب نوجوان ہلاک ہو چکے ہیں،

تنقیدی کیڑا

یہ ایک انتہائی درد میں مبتلا رکھنے والا کیڑا ہے، اس کے ہوتے ہوئے انسان ایک لمحے کو چین سے نہیں بیٹھ سکتا، اس کیڑے کے کاٹنے سے بندہ جتنا زیادہ خود پسند ہوتا ہے اتنا ہی دوسروں کیلئے تعریف میں بخیل ہو جاتا ہے، یہ ان چند کیڑوں میں سے ایک ہے جو خود کو جدید دور کے تقاضوں سے مکمل ہم آہنگ کیے ہوئے ہیں، ویسے تو آپ کسی بھی فیلڈ میں ہوں آپ کو ایسے لوگ مل ہی جائیں گے جو اس کیڑے کا شکار ہوں لیکن ادب میں اس کے شکار لوگ زیادہ کثرت سے پائے جاتے ہیں، یہ کسی بھی تحریر میں کیڑے نکالنے کے فن میں پوری طرح طاق ہوتے ہیں، ان سے بحث و مباحثہ ان کے کیڑے کو مزید تقویت دیتا ہے اور ان کی تکلیف میں اضافے کا سبب بنتا ہے، لہٰذا خاموشی اور درگذر ہی ان کا واحد اچھا علاج ہے

منافق کیڑا

ویسے تو اس کیڑے کے جملہ حقوق سیاستدانوں کیلئے محفوظ ہیں اور یہ خاص ان ہی کیلئے ہوا کرتا تھا لیکن یہ کیڑا اب عوام میں بھی اس درجہ پایا جاتا ہے کہ ہر آدمی سیاستدان لگنے لگا ہے، منافق کیڑا بڑا ہی چالاک مکار فریبی دھوکے باز ہوا کرتا ہے، اس کیڑے کہ کاٹنے سے انسان کو مختلف روپ بدلنے کی صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے، اس کیڑے کا شکار جتنے عالی منصب پر ہو یہ اتنا ہی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے، منافق کیڑے کا زیادہ دیر تک بندے میں قیام انتہائی خطرناک ہوا کرتا ہے یہاں تک کے انسان

دوسروں کے علاوہ خود کو اور آخر کار خدا کو بھی دھوکہ دینے کی کوشش شروع کر دیتا ہے،

عاشق کیڑا

سب سے پہلا قتل حضرت انسان نے اسی کیڑے کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا، عاشق کیڑا انتہائی خطرناک اور نہایت دلچسپ کیڑا ہے، مجنوں فرہاد ماہیوال اور دیگر بے شمار معروف کردار اسی کیڑے کا شکار ہوئے، اس کیڑے کی کارستانیوں سے معاشرے پر کچھ اچھے اثرات بھی مرتب ہوئے، بہت سے اچھے نامور شاعر، ادیب، فنکار، کلاکار، صرف اسی کیڑے کے سبب دنیا نے دیکھے، یہ کیڑا پہلے زمانے میں زیادہ تر صرف مخالف جنس میں کشش محسوس کر کے

ایکٹویٹ ہوا کرتا تھا آج کل روشن خیالی کی زیادتی کے باعث اپنی جنس میں بھی دلچسپی لینے پر مجبور کرتا ہے، اس کیڑے کے زیادہ تر جراثیم کا گڑھ ہمارے سکولز و کالجز ہیں، فی زمانہ ہر دوسرا شخص کسی نا کسی صورت اس کیڑے کا شکار نظر آتا ہے۔

احساس برتری کا کیڑا

ابلیس اس کیڑے کا سب سے پہلا شکار تھا، اس کی خطرناکی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ایک بڑے عالم فاضل عبادت گزار کو اس نے شیطان بنادیا، یہ کیڑا بعد ازاں انسانوں میں بھی بدرجہ اتم پایا گیا، جدید دور میں گورے اس کا خاص شکار نظر آتے ہیں، کالوں کو دیکھ کر جب آپ انہیں برے برے منہ بناتے ہوئے دیکھیں تو سمجھ لیں ان کے اندر احساس برتری کا کیڑا ایکٹویٹ ہو چکا ہے، اس کیڑے کے کاٹنے سے لسانی، مذہبی، معاشی اور ہر طرح کا معاشرتی تعصب انسان میں پیدا ہو جاتا ہے۔

خوش فہم کیڑا

یہ اگر چہ دنیا کے ہر آباد براعظم میں وجود رکھتا ہے، لیکن جنوبی ایشیا کے چند ممالک اور پھر خاص کر پاکستان اس کیڑے کا پسندیدہ ترین مقام ہے، یہ بہت ہی زیادہ طاقتور ہوتا ہے، جب یہ کیڑا دل و دماغ میں گھر کر جائے تو پھر چاہے روز پندرہ سولہ لوگ ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوں یا درجنوں بچے قحط کا شکار ہو کر مر جائیں، یہ ہمیشہ ہم عظیم قوم ہیں کہ ترانہ لبوں پر جاری رکھوا تا ہے۔ اس کیڑے کے کاٹے جانے سے سنگین حالات بھی رنگین ہی نظر آتے ہیں، ویسے تو فرد واحد کیلئے بھی یہ کیڑا کم خطرناک نہیں لیکن اگر یہ کسی پوری قوم کو کاٹ لے تو اس سے زیادہ بدنصیبی کی کوئی بات نہیں، اور آپ مانیں یا نہ مانیں بدقسمتی سے ہم اس کیڑے کے اجتماعی شکار ہیں۔

سر سید احمد خان ایک دفعہ ریل میں سوار تھے۔ کسی اسٹیشن پر دو انگریز ان کے ڈبے میں آ بیٹھے۔ ان میں سے ایک پادری تھا۔ اسے کسی طرح معلوم ہو گیا سر سید احمد خان یہی شخص ہے۔ پادری ان سے یوں مخاطب ہوا "مدت سے آپ سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔"

سر سید احمد کان نے کہا "میں نہیں سمجھا، آپ کس کی باتیں کرنا چاہتے ہیں؟"

"پادری" خدا کی۔

سر سید احمد خان" (کمال سنجیدگی سے) میری تو کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"پادری" (متعجب ہو کر) ہیں۔۔۔ آپ خدا کو نہیں جانتے۔

سر سید احمد خان" مجھ ہی پر کیا موقوف، جس سے ملاقات نہ ہوئی ہو، اسے کوئی بھی نہیں جانتا۔" پھر کسی کا نام لیکر پوچھا "آپ اسے جانتے ہیں"

"پادری "نہیں میں اس سے کبھی نہیں ملا۔

سر سید احمد خان" پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اسے اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو، نہ مجھے اس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اسے میں کیوں کر جان سکتا ہوں۔

پادری یہ سن کر خاموش رہا اور دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا "یہ تو سخت کافر ہے۔"

کائنات بشیر

ہم کو ہنستے دیکھ زمانہ جلتا ہے

کم عمری کی شادی۔۔

ٹین ایج۔۔ نادانیوں اور شروع ہونے والی جوانی کی خبردار کرتی، وارننگ دیتی عمر سمجھی جاتی ہے۔ جب بچپن کی تتلیاں ابھی خوابوں میں اڑتی ہیں اور شریر بھنورے حیرانی سے باغ کی بہاروں کو دیکھتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک خبر سنی۔ ایک فیملی نے اپنے سترہ سالہ بچے کی شادی کر دی یعنی اسے جوانی کی بہاروں میں جھومنے اور تالاب میں ہاتھ پاؤں مارنے کا موقع ہی نہ دیا اور مزے کی بات یہ ہوئی کہ ادھر لڑکے کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو اس کی ڈبل ترقی ہوگئی۔

ایک تو اس لڑکے نے (اب تو اسے لڑکا کہتے ہوئے شرم آئے گی) معصوم بچپن، نادان، غلطیوں بھرے ٹین ایج کو خدا حافظ کہہ کر جوانی میں دم رکھ دیا اور دوسرا ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔۔ ماں باپ جو ایک سال پہلے اس کی شادی کا طبل بجا چکے تھے اب پوتے کی آمد پر نقارہ بجانے لگے۔۔ دادا، دادی بننے پر خوب نہال تھے۔ ان کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ لگتا تھا انھوں نے وقت اور زمانے پر کمنڈ ڈال دی ہے۔ مٹھائیوں کے منہ کھل گئے۔ خوشی کے شادیانے بجنے لگے اور دیکھنے سننے والوں نے حیرت سے دانتوں میں انگلی دبا لی۔۔ زمانے کو نئی چال چلتا دیکھ بہت سے احباب بھونچکا رہ گئے۔۔ جن گھروں میں ابھی کئی کئی لڑکے، لڑکیاں بیاہنے کی صورت موجود تھے۔ ان پر تو بہت زیادہ وزن آ گیا۔ انھیں لگا کہ صحیح مار تو انھیں پڑی ہے۔۔ دراصل پہلے وقتوں شادی کے لیے ماں باپ قبل از وقت پریشانی کندھوں پر اٹھایا کرتے تھے لیکن وہ بھی صرف لڑکی کی، لڑکے کی شادی کو تو کبھی بھی معاشرتی مسئلہ بنایا ہی نہیں گیا۔ ادھر لڑکی کی شادی کم عمری میں کر دینے کے قائل تھے۔ کچھ سال پہلے ہم نے پاکستان میں ایک گھر میں کام کرنے والی ملازمہ دیکھی جو اپنے ساتھ دو ڈھائی سال کے نواسے کو بھی ساتھ لے کر آئی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کی اپنی عمر ابھی تیس سال تھی۔ ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔۔ اس سے قبل ہماری گنہگار آنکھوں تینتیس سال کی کنواریاں اور کنوارے ہی دیکھے تھے۔۔ ہماری حیران آنکھیں دیکھ کر وہ ہنس پڑی اور اس نے بتایا کہ اس کی شادی والدین نے تیرہ سال کی عمر میں کر دی تھی۔ ایک سال بعد وہ بیٹی کی

ماں بن گئی۔ اوراب آگے اس نے بھی اپنی بیٹی کی شادی تیرہ سال کی عمر میں ہی کردی۔ یوں اٹھائیس سال کی عمر تک پہنچتے وہ نانی بن چکی تھی۔ اس سلسلے کو یوں نسل درنسل دراز دیکھ کراب ہم بھی کھل کر ہنس پڑے۔۔

پَر کیا کیجیے، ہماری سوچ کا پورا وزن لڑکی کی پیدائش، والدین کا جلد از جلد اپنی ذمہ داری پورا کرنے پر مرکوز ہو گیا تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نمبر رعایت میں دینے پڑے۔ حالانکہ اختلاف اپنی جگہ برقرار تھا کہ والدین نے اپنی بیٹی کو تعلیم جیسے زیور سے آراستہ کرنے، شعور دینے کی بجائے اس پر شادی اور نتیجے میں چلی آنے والی اولاد کی صورت ڈبل ذمہ داری ڈال دی تھی۔ ملک کی آبادی میں بھی قبل از وقت اضافہ ہوا۔۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ اپنے ناقدانہ حالات کی بدولت اسے اپنا معاشی بوجھ بھی خود اٹھانا پڑا۔ پھر ستم در ستم آگے اس نے بھی اپنی بیٹی کے ساتھ شادی کی صورت کردیا کہ وہ بھی تعلیم حاصل نہ کر پائی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب دونوں ماں بیٹی مختلف گھروں میں روزگار کا جگاڑ کرنے کے لیے کام کر رہی تھیں۔ اگر کم سے کم بھی اپنی بیٹی کو تعلیم سے آراستہ کر دیتی تو یقیناً اس کے کمانے کا طریقہ کار کچھ باعزت اور بہتر ہوتا۔۔!

اب اسے سادہ دلوں کی سادگی کہیں یا معصومیت یا شکر گزاری کہ۔۔!

کچھ لوگ اسی میں خوش رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہی وہ اپنے لیے تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی خوشیاں لمبی چوڑی نہیں ہوتیں۔ ان کے خواب انھیں زیادہ چکاچوند نہیں دکھاتے۔ انکی خواہشات، مقاصد، گول لمبے چوڑے نہیں ہوتے۔ ان کی سوچ ایک محدود دائرے میں گھومتی رہتی ہے۔ کیونکہ ہم نے دیکھا کہ ماں اور بیٹی دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مطمئن اور خوش تھیں اور اسے اللہ کی رضا سمجھ رہی تھیں۔ تیس سالہ نانی اپنی قبل از وقت شادی کو وقت اور زمانے کے ریت رواج اور ماں باپ کی مجبوری پر ڈال کر مطمئن تھی کہ ان وقتوں میں ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔۔ اپنی بیٹی کی بھی اسی لیے اس نے جلد شادی کر دی کہ جلد شادی کی ریت

اب اس کے خاندان میں رواج پا چکی تھی۔ اور اب اپنے فیصلے کے بروقت کرنے، ٹھیک ہونے کی سند اور خوشگوار انجام کی صورت نواسے کی خوشی اس کے بازؤں میں تھی۔ اس لیے اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ اِدھر بیٹی بھی مطمئن تھی کہ اتنی کم عمری میں اسے اولادِ نرینہ مل گئی۔ شوہر مل گیا، گھربار مل گیا۔۔ اور بچے کا کیا ہے وہ تو نانی اور ماں کے ہاتھوں میں پل ہی جائے گا۔۔

اوپر سے دلچسپ بات یہ نظر آئی کہ زمانے کو بھی تیس سالہ نانی ایک خوش نصیب عورت لگ رہی تھی۔۔ جس نے اتنی سی عمر میں اگلی نسلوں کی آمد اور ان کا سُکھ دیکھ لیا تھا۔ اس لیے ماں بیٹی کو اس وقت اگر کوئی شکوہ تھا تو صرف اور صرف روپے کی کمی سے تھا جسے حاصل کرنے کے لیے وہ کئی گھروں میں کام کر رہی تھیں۔ ان کی خوشی دیکھ کر ہم نے بھی بات سے بات نکالنے کی بجائے بات کو لپیٹ دیا۔ ویسے بھی اس پنگے میں پاؤں ڈالنے کا کیا فائدہ جہاں

مدعی سست اور گواہ چست ہو۔۔!

اور جہاں تک نسل کی بات ہے۔ تو جس دن مشہور انڈین اداکار دھرمیندر کے پوتا (سنی دیول کا بیٹا) پیدا ہوا تو اس وقت دھرمیندر کا باپ زندہ تھا۔ جس نے یہ خوشی کی خبر سنتے ہی مندر میں ماتھا ٹیک دیا کہ آج اس نے اپنی زندگی میں چھ نسلیں دیکھ لی تھیں۔ تو ہمیں لگا کہ تیس سالہ نانی یقیناً اس سے بھی آگے بڑھ جائے گی اور ایک دو نسلیں زیادہ ہی دیکھے گی۔۔

اب رہی بات اُس نوعمر سترہ سالہ شوہر اور اٹھارہ سالہ کم عمر باپ کی۔۔

کیا ہوا جو اس نے۔۔!

نادانی کی عمر ایک اور نادانی کر لی۔۔

جوانی کے تالاب میں ڈبکیاں نہیں لگائیں۔۔

تعلیمی میدان میں کوئی جھنڈے نہیں گاڑے۔۔

کوئی بڑا آدمی بننے کے خواب نہیں دیکھے۔۔

کوئی آئیڈیل نہیں تراشا۔۔

محبت کا تجربہ کیے بغیر دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا لیا۔۔

ابھی شادی اور بیٹے کی خوشی اس کی تمام خواہشات کا حاصل بن کر اسکے سامنے ہے جس کے ہنڈولے میں بیٹھا وہ جھول رہا ہے۔ اور سوچ رہا ہے کہ اس کے جوان رہتے بیٹا بھی اس کے قد کے برابر آن کھڑا ہوگا۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ،

کیا اب مستقبل میں وہ بھی بیٹے کی شادی اسی کم عمری میں کر دے گا یا۔۔

بیٹے کے ذریعے اپنے خواب پورے کرنے کی کوشش کرے گا۔۔

ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔۔

ابھی تو ڈگڈی ہاتھ میں ہے اور اِک لمبی تان۔۔

جیتا ہے جلتے کوئی یہاں بے فکر کسے

آج کا ٹھکانہ کر کل کی خبر کسے

بدتمیزی

بے خود اور سائل کسی مشاعرہ میں یکجا نہیں ہوتے تھے، کیونکہ مسئلہ یہ ہوتا کہ سب سے آخر میں کون پڑھے۔ دونوں ہی استاد تھے اور ایک سے مرتبے کے تھے۔ اس لئے منتظمین مشاعرہ کو پریشانی سے دور رکھنے کے لئے دونوں میں سے کوئی ایک ہی مشاعرہ میں آتا تھا۔

ایک بار کچھ لوگوں کو شرارت سوجھی، اور دونوں کو بتائے بغیر ایک ساتھ مشاعرہ میں بلا لیا۔ دونوں نے بزم میں ایک دوسرے کو دیکھا، مگر پلٹ کر کوئی نہ گیا۔ خاموشی سے آکر مسند پر بیٹھ گئے۔ دوران مشاعرہ باہم کلام بھی نہ کیا۔

تمام شاعر پڑھ چکے تو ناظم مشاعرہ بھی خاموش ہو بیٹھے۔ مجمع منتظر کہ دیکھیں کیا گل کھلتا ہے۔ چند لمحہ سناٹے کے بعد بے خود نے شیروانی کی جیب سے ایک پرزہ نکالا جس پر ان کی تازہ غزل تھی۔ یہ دیکھ کر کہ بے خود ان سے پہلے پڑھنے پر آمادہ ہیں، سائل نے کہا۔۔۔۔ "ہائیں، ہائیں، یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

بے خود نے یہ سن کے پرزہ جیب میں واپس رکھتے ہوئے سائل کو جواب دیا۔۔۔ "تو یہ بدتمیزی تم کر لو!"

اور یوں مشاعرہ بیخود کی غزل پر تمام ہوا.

تشکر: علی گڑھ اردو کلب

کے ایم خالد

درخواستیں

جناب تھانہ انچارج

عنوان: درخواست برائے درج کئے جانے ایف آئی آر برائے چوری شدہ شاعری

جناب عالی!

گزارش ہے کہ فدوی آپ کے تھانے کی حدود میں ایک مضافاتی علاقے موضع ہوشیار سے تعلق رکھتا ہے۔اس علاقہ کی زمین شاعری کے لئے بہت زرخیز ہے اور یہاں روز بروز نئے شاعر پیدا ہو رہے ہیں۔فدوی اس علاقے کا ایک مشہور شاعر ہے جس کا کلام علاقے کے بھانڈوں اور بینڈ باجے والوں میں بہت مشہور ہے فیس بک پر فدوی ہوشیار بھائی کے نام سے مشہور ہے۔فیس بک پر بھائی کے کلام پر لائک کی تعداد سینکڑوں میں ہے ۔بھائی کا کلام تقریباً پانچ سو صفحات تک جا پہنچا تھا۔جسے کسی شاعری دشمن نے رات کے اندھیرے میں چرا لیا اب وہ نانہجار میرے کلام کو اپنے نام کے ساتھ فیس بک پر روزانہ اپ لوڈ کرتا ہے۔اس کا یہ فعل میری بدنامی کا باعث بن رہا ہے اور علاقہ کے لوگ جو میری شاعری کے معترف تھے مجھے چربہ اور سرقہ کے نام سے پکارتے ہیں۔آپ کے حضور فدوی اس بات کا اظہار کرتے کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتا کہ بھائی نے تک بندی سے کلام موزوں تک کا سفر کیسے طے کیا۔علم عروض تو وہ بھول بھلیاں ہیں کہ شائد ہی کوئی شاعر اس دشت کی مکمل سیاحی کر سکے۔فدوی کو چند قابل بھروسہ لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ جناب بھی شاعری سے شغف رکھتے اور بسمل تخلص فرماتے ہیں لیکن آپ کو جو کلام میرے ہاتھ لگا ہے وہ کلام موزوں نہیں ہے اور علم عروض پر پورا نہیں اترتا۔میں آپ جناب کے کلام کو موزوں کر سکتا ہوں بلکہ آپ سے کیا پردہ ایک ویب سائٹ بھائی کے ہاتھ لگی ہے جو کہ آپ کے کلام کو موزوں کرنے میں آپ کی معاون ثابت ہو سکتی ہے فدوی نے بھی وہیں سے استفادہ کیا ہے۔

جناب۔۔۔گزارش ہے کہ پانچ سو صفحات پر میری ایک ہزار کے قریب شاعری کی مختلف اصناف درج ہیں میں نے آپ جناب کا ایک کام کیا ہے تو فدوی کی بھی شاعری کی چوری کی ایف آئی آر کاٹی جائے تا کہ بھائی اسے فیس بک پر مشتہر کر کے اپنی روز بروز پھیلنے والی بدنامی کو روک سکے۔

العارض

ہوشیار بھائی، ہوشیار پور

☆☆☆

جناب فیس بک انتظامیہ

عنوان: فدوی کو فیس بک پر ان فرینڈ کرنے والوں کی تعداد میں تشویش ناک حد تک اضافہ

جناب عالی!

گزارش ہے کہ فدوی ایک باضابطہ شاعر ہے۔ جس کی شاعری کے نمونے آپ کو جا بجا فدوی کے ذاتی ٹائم لائن پر بکھرے ہوئے ملیں گے کیونکہ دوسرے بے پر کے شاعر فدوی کے کلام موزوں سے خوف کھاتے ہیں اس لئے بیشتر حضرات نے فدوی کے کلام کو اپنی ٹائم لائن پر رسائی دینے سے معذرت کر رکھی ہے جبکہ بہت سے لوگ میرے کلام کے ساتھ ٹیگ ہونے پر احتجاجاً نہ صرف فدوی کو ان فرینڈ کر دیتے ہیں بلکہ فدوی کے کلام کی بھی فیس بک کی انتظامیہ کو بھی رپورٹ کر دیتے ہیں۔ جس سے فدوی کافی دفعہ مہینوں کے حساب سے بلاک رہ چکا ہے۔ اپنا ایک کلام جس نے فدوی کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی ہیں فیس بک انتظامیہ کے گوش گزار کر رہا ہے۔ جس سے انتظامیہ فدوی کی شاعری کے معیار کا اندازہ کر سکتی ہے

تانگے کے آگے گھوڑا
گھوڑے کے پیچھے تانگہ
سرپٹ بھاگ گھوڑے
ورنہ چابک دوں گا
تو دوڑتا کیوں نہیں
تو مانگتا ہے کیا مجھ سے
جو مانگتا ہے تو
وہ میں نہ دے سکوں گا
میں تو بس چابک ہی دے سکوں گا

جناب فدوی کے اس کلام کے بدلے میرے محلے کے شاعر کا کہنا ہے اس کلام کے بدلے وہ اپنی پوری شاعری تیاگ سکتا ہے اس بات سے فیس بک کی انتظامیہ فدوی کے ادبی قد کاٹھ کا اندازہ کر سکتی ہے

جناب فدوی جب تک فیس بک پر چپ رہا اس کے فیس بکی دوستوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی رہی لیکن جب سے فدوی نے اپنا کلام فیس بک پر مشتہر کرنا شروع کیا ہے فدوی کے فیس بک کے دوستوں کی تعداد میں تیزی سے کمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جس کی فدوی کو بہت تشویش ہے فیس بک انتظامیہ سے اپیل ہے کہ کہ وہ فدوی کے کیس کو اسپیشل سمجھتے ہوئے کچھ ایسے اقدامات کرے کہ کوئی فیس بک کا دوست فدوی کو ان فرینڈ نہ کر سکے اور فدوی جسے چاہے ٹیگ کرے اور جس کی ٹائم لائن پر چاہے اپنا مال پھینکے۔

العارض
فیس بک آئی ڈی
دتہ چابک شاعر

☆☆☆

عامر راہداری

بجلی...

بجلی کی کئی اقسام ہیں. لیکن آج کل تین اقسام زیادہ مشہور ہیں.

ا۔آسمانی بجلی

یہ بجلی بالکل مفت میں ملتی ہے لیکن یہ اتنے شدید طریقے سے ملتی ہے کہ نہ ہی ملے تو بہتر ہے. کچھ لوگ تو اس بجلی کو گناہوں کی سزا بھی کہتے ہیں. یا ان کچھ لوگوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی ورنہ ساری سزائیں بھول جاتے. اس بجلی کو پانے کے لئے انسان کو عالم برزخ میں جانا پڑتا ہے اس لیے اس بجلی کو زمین پر گرتے دیکھ کر منہ سے لاحول ولا نکل جاتا ہے. اس بجلی کی ایک بری بات یہ بھی ہے کہ پاکستانیوں کی ہزاروں دعاؤں کے باوجود یہ واپڈا والوں پہ نہیں گرتی. اسی سے پتا چلتا ہے کہ "مجھیں مجھیں دیاں بھینیں ہوندیاں نیں" (بھینسیں بھینسوں کی بہنیں ہوتی ہیں)

آسمانی بجلی زمینی بجلی کی رشتہ دار ہونے کے باعث اس کا خاص خیال رکھتی ہے.

اس بجلی کو اکثر ساس بہوئیں بددعاؤں میں استعمال کرتی ہیں حالانکہ یہ بددعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں لیکن آسمانی بجلی کا بددعا میں استعمال ہونا اس کا اکلوتا فائدہ ہے.

آسمانی بجلی کے گرنے سے بچے، جوان، عورتیں حتیٰ کہ بوڑھے بھی ڈر جاتے ہیں حالانکہ اس کا نہ تو بل آتا ہے اور نہ ہی کرنٹ، تو پھر اس سے ڈرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں بنتی، خیر ہر کسی کی اپنی مرضی..

آسمانی بجلی کا ایک فائدہ اور بھی ہے لیکن یہ فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جن کی بارش میں ڈیٹ ہو جائے یا جن کی ڈیٹ میں بارش ہو جائے. خوبصورت اور ڈرپوک محبوبہ ساتھ ہو اور اچانک بجلی چمکے آہ کتنی دعائیں نکلتی ہیں منہ سے. بلکہ اکثر محبوب کو پوری ڈیٹ یہی دعا کرتے گزار دیتے ہیں کہ "یا اللہ بجلی چمکا دے"

آسمانی اور زمینی بجلی کی ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں کے گرنے کے بعد دھماکہ ضرور ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ آسمانی بجلی گرنے کے فوراً بعد دھماکہ ہوتا ہے اور زمینی بجلی گرنے کے ایک مہینہ بعد..

۲۔زمینی بجلی

یہ بجلی کی سب سے اہم اور کم میسر قسم ہے. پاکستان میں یہ بجلی بھی اہرام مصر کی طرح تاریخی حیثیت کی حامل ہے. اور ہماری تمام حکومتوں کی بھرپور کوششوں کی بدولت اس کو آٹھواں عجوبہ قرار دیا جا چکا ہے.

پاکستان میں یہ بجلی آج کل یوں ملتی جیسے چھوٹے دیہاتوں میں محبوب ملا کرتے ہیں موقع ملے تو دو گھنٹے بھی مل جاتے ہیں

ورنہ دومنٹ کے لئے تو نظارہ ہو ہی جاتا ہے۔

پچھلے دنوں ایک صاحب فرما رہے تھے کہ لوڈ شیڈنگ اصل میں سولر پینل بیچنے والے کروا رہے ہیں تاکہ ان کے سولر پینل زیادہ سے زیادہ بک جائیں۔

ایک تحقیق کے مطابق پچھلے 5 سال میں پاکستان میں سب سے زیادہ استعمال لفظ "بجلی" ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہماری بجلی انعام کی مستحق قرار پاتی ہے۔ بلکہ اب تو نومولود بھی پیدائش کے فوراً بعد ماں کی بجائے بجلی کہتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

بجلی دنیا کی واحد ایجاد ہے جس کی کاپی چائنہ والے اور پٹھان نہیں بنا پائے ویسے اگر چائنہ بجلی دوکانوں پہ دستیاب ہوتی تو عجیب صورت حال ہوتی۔ ہماری عام گفتگو کچھ اس طرح کی ہوتی،

یار دوکان پہ جا رہے ہو تو 100 روپے کی بجلی لیتے آنا کل سے نہایا نہیں ہوں،

بیویاں اپنے شوہروں سے کچھ اس طرح مخاطب ہوتیں

اجی صرف 30 روپے کی بجلی باقی ہے اور رات کو ساس بہو والا ڈرامہ بھی ہے تو 30 روپے میں تو پہلی بریک ہی دیکھ پاؤں گی، تھوڑی سی اور ڈلوا دیں

خیر شکر ہے کہ چائنہ والوں کو خیال نہیں آیا ورنہ ہمارے واپڈا بے چارے کا کیا حال ہوتا، بھوکوں مر جاتے،

سنا ہے پاکستان میں واپڈا وہ واحد فرض شناس ادارہ ہے جو اپنا کام پوری دیانت داری سے کر رہا ہے دیکھا جائے تو اس فرض شناسی کی بدولت واپڈا حکام کے جنت میں جانے کے کافی چانسز ہیں۔

زمینی بجلی کے کئی استعمالات ہیں اکثر لوگ اپنی بات منوانے کے لئے والدین کو دھمکی دیتے ہیں کہ اگر بات نہ مانی گئی تو خود کو کرنٹ لگوا کر خودکشی کر لیں گے لیکن بھلا ہو واپڈا والوں کا کہ اب بجلی کا یہ استعمال بھی پاکستان میں معدوم ہو گیا ہے۔

۳۔ محبوبہ بجلی

یہ بجلی کی سب سے اہم اور محبوب قسم ہے۔ محبوب کے لفظ سے آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ یہ کونسی والی بجلی ہے۔ اس بجلی کا زیادہ تر استعمال گانوں اور شاعری میں ہوتا ہے جیسے،

"بابو جی ذرا دھیرے چلو بجلی کھڑی یہاں بجلی کھڑی"

یوں تو بجلی کوئی بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کے لئے سپیشل قسم کے کرنٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کل یہ کرنٹ سرخی پوڈر اور بازاری کریموں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اکثر والدین اپنی بیٹیوں کا نام بھی بجلی رکھ لیتے ہیں شاید وہ یہ سوچ کر رکھتے ہوں کہ لوگوں کو بتا سکیں کہ ہمارے گھر میں بجلی بھی ہے اور بل بھی نہیں آتا۔ اور اکثر والدین یہ نام یہ سوچ کر نہیں رکھتے کہ واپڈا والے گھر میں غیر قانونی بجلی رکھنے پر بل ہی نہ بھیج دیں۔

اس طرح کی بجلی اکثر بیشتر میلوں ٹھیلوں میں تھروں اور میجک شوز کے پھٹوں پر دیکھنے میں آئی ہے۔ ہماری پاکستانی خسرا پروڈکشن نے اس نام کے جملہ حقوق تقریباً محفوظ کئے ہوئے ہیں۔

پچھلے دنوں ہمارے ایک خوبرو لیکن وہمی قسم کے دوست کو ایک لڑکی نے جس کا نام بدقسمتی سے بجلی تھا، کی دوستی کی آفر آئی تو محترم یہ گھمبیر مسئلہ ہمارے پاس لے آئے۔ اور پوچھا کہ کیا کریں؟

ہمارا پہلے تو جلن سے حال بے حال ہو گیا تھوڑا ہوش آیا تو حلق سے ایک عجیب سی غیر شناسا آواز سن کر حیران ہو گئے

" آپ کو محترمہ سے دوستی کر لینی چاہئے"

وہ بولے، راہداری صاحب دوستی کرنے میں تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان کا نام " بجلی " ہے

بجلی نام ہے تو کیا ہوا؟

ہم پھر اپنے حلق سے منافقانہ مشورہ سن کر حیران ہو گئے

"ارے جو بھی بولیں لیکن بجلی نام ہونے کی نسبت سے ان کے ہوٹلوں کے بل چکاتے چکاتے ہم اپنے ابا مرحوم کی دولت کو صرف "بجلیوں" کی نذر نہیں کر سکتے۔ (اِن کے بجلی کے بل بھی تمام حدود کراس کر کے ان کے پاس پہنچتے تھے)

"اس لئے ہم انہیں انکار کرنے والے ہیں"

پتا نہیں کیوں ان کا یہ جواب سن کر ہمارا دل کیا انہیں چوم لیں۔

لیکن اس وقت ہم پوری شدت سے بددعائیں دے کر بھی ان کا قرض چکانے سے قاصر ہیں کیونکہ ان محترمہ بجلی کے بل اب ہم چکاتے ہیں۔

مرزا محمد تقی خان کے مکان پر ایک مشاعرہ تھا، جس میں شہر کے سب نامی رئیس اور شاعر جمع تھے، میرؔ اور جراتؔ بھی تھے جراتؔ نے جو غزل پڑھی اس پر بہت واہ واہ ہوئی اور بہت تعریفیں ہوئیں، وہ ازراہِ شوخی میر صاحب کے پاس آ بیٹھے اور اپنے کلام کی داد چاہی، میرؔ صاحب نے ایک دو مرتبہ تو ٹالا مگر جب انہوں نے اصرار کیا تو تیوری چڑھا کر فرمایا" تم شعر کہنا کیا جانو! اپنے تئیں چوماچاٹی کر لیا کرو"۔

زریاب شیخ

پرنس کی کتابوں سے

بھائی مت کہو صرف جان کہو

دل جسم کا بہت نازک حصہ ہے یہ کانچ کی چوڑی اور دھاگے سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے، سائنس کہتی ہے کہ دل ٹوٹنا صرف محاورہ ہی نہیں ہے واقعی ہی میں دل ٹوٹ سکتا ہے، ایک سروے کے مطابق ہر روز ہزاروں لڑکوں کا دل اس وقت ٹوٹ جاتا ہے جب کوئی لڑکی ان کو بھائی کہتی ہے، لڑکیوں کی اکثریت چونکہ خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں اس لئے فوراً اس لڑکے کو بھائی بنا لیتی ہے جس کے فری ہونے کا خطرہ ہو اور بازاوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کو پسند کرتی ہے اس سے بھی خوبصورت لڑکا زندگی میں آجاتا ہے اور اپنے محبوب کو خوش رکھنے کیلئے مجبوراً اس کو پھر خوبصورت لڑکے کو بھائی بنانا پڑتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر لڑکی کو الطاف بھائی اور منا بھائی کے علاوہ سارے بھائی پسند ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ لڑکیوں کی اکثریت ابھی تک کنواری ہے، پاکستان میں اتنے محبوب نہیں جتنے بھائی ہیں، اسلام میں منہ بولے بھائی کا کوئی تصور نہیں، دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر لڑکے جو پہلے بھائی بنے وہ بعد میں شوہر بن گئے اس سے فرق تو نہیں پڑتا لیکن بھائی کے تقدس بھرے رشتے کی بدنامی ہوتی ہے، مصنف کو بھی کوئی لڑکی آئندہ سے بھائی جان مت کہے، خالی جان کہہ لے تو زیادہ ٹھیک ہے، اس سے مصنف کی گرتی صحت پر مثبت اثرات پڑ سکتے ہیں۔

پرنس کی کتاب "مجازی بھائی" سے اقتباس

یہ آنکھیں دیکھ کر ہم پہلی والی بھول جاتے ہیں

آنکھیں اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں، اس سے اچھا بُرا سب کچھ دیکھ سکتے ہیں اور جو لوگ بہت شریف ہوتے ہیں وہ POGO بھی شوق سے دیکھتے ہیں، بعض لوگ اپنی آنکھوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کی اسی خوبی پر حساس ادارے ان کو دوسروں پر نظر رکھنے کیلئے بھرتی کر لیتے ہیں، سائنس سے یہ ثابت ہے کہ عورت کی نظر مرد کی نظر سے تیز ہوتی ہے اگر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کوئی جھوٹ بولے تو وہ فوراً پکڑ لیتی ہے، اسی لئے آج کی نوجوان نسل کسی بھی لڑکی سے اظہار محبت کرتے ہوئے کالے شیشے لگا لیتی ہے، آنکھوں سے اچھی چیزیں دیکھیں تو اس کا اچھا اثر پڑتا ہے اور اگر بری چیزیں دیکھیں تو دل اور دماغ کے ساتھ ساتھ شکل بھی بلے ہوئے پکوڑے جیسی ہو جاتی ہے، اسلام میں مرد کو نظریں جھکانے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ کوئی لڑکا جب کسی حسین لڑکی کو دیکھتا ہے تو اس کے دماغ کے تار فیوز ہو جاتے ہیں اور اگر غلطی سے فردوس عاشق اعوان پر نظر پڑ جائے تو دماغ خراب بھی ہو سکتا ہے، لڑکیاں اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہیں وہ کسی مرد کی طرف دیکھیں یا نہ دیکھیں دونوں صورتوں میں نقصان بیچارے مرد کا ہی ہوتا ہے، خواتین آنکھوں سے نہ صرف اظہار محبت کرتی ہیں بلکہ اچھے اچھوں کو بلیک میل بھی کر لیتی ہیں، میرے ایک دوست سے پچھلے دنوں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ جب سے شادی ہوئی ہے نقصان ہی ہو رہا ہے تیری بھابھی خوش ہو تو آنسو نکلتے ہیں ناراض ہو تو آنسو نکلتے ہیں دونوں صورتوں میں میری جیب کٹ جاتی ہے، خواتین کو آنکھوں کا دوسرا فائدہ ونڈو شاپنگ ہے، کچھ لینا ہو یا نہیں ونڈو شاپنگ تو کرنی ہی کرنی ہے اور شوہر بے چارا کولہو کے بیل کی طرح ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے، سیانے کہتے ہیں کبھی بھی اپنی بیوی کے سامنے کسی دوسری عورت کی طرف مت دیکھو وہ نظروں سے چلنے والے تیر آسانی سے دیکھ لیتی ہے، یہ ان کی آنکھوں کا ہی قصور ہے کہ مجازی خدا کی قمیص پر باریک سے باریک زنانہ بال بھی نظر آ جاتا ہے اور اس کے بعد مرد فٹبال بن جاتا ہے، اکثر خواتین جب لڑتی ہیں تو یہ جملہ ضرور بولتی ہیں کہ "میرا بس چلتا تو اس کی آنکھیں ہی نوچ لیتی"۔

آنکھ نہ صرف دیکھنے کے کام آتی ہے بلکہ مارنے کے کام بھی آتی ہے میرے دوست کئی خواتین سے گال اپنے لال کروا چکے ہیں، بیچارے کی آنکھ خود بہ خود بار بار بند ہوتی ہے اور لڑکیاں اس کا کچھ اور مطلب لے لیتی ہیں لیکن اللہ بڑا مہربان ہے اسی آنکھ مارنے کے باعث آج وہ ایک پیاری سی جورو کے غلام ہیں۔

برنس کی کتاب "پپو آنکھیں" سے اقتباس

مرچیں کھائیں مگر مرچیں نہ لگائیں، بڑی مہربانی

کھانے میں مرچیں نہ ہوں تو کھانے کا لطف ہی نہیں آتا اور اگر باتوں میں مرچیں ہوں تو سننے والے کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے، اکثر لوگ بات ایسی کرتے ہیں کہ سنتے ہی مرچیں لگ جاتی ہیں، جس طرح کھانے میں مرچوں کو بیلنس رکھنا ایک فن ہے اسی طرح لفاظی میں مرچوں کا استعمال اگر متوازن طریقے سے کیا جائے تو بات بھی چٹ پٹی ہو جاتی ہے اور سننے والے کو مرچیں لگنے کی بجائے لطف آتا ہے، بعض لوگوں میں یہ بیماری ہوتی ہے کہ وہ بات ہی ایسی کرتے ہیں کہ مرچیں لگ جاتی ہیں اور پھر وہ تماشہ دیکھتے ہیں اور لوگ آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں، ہمیں ایسی باتوں سے گریز کرنا چاہئے جس سے دوسروں کو مرچیں لگیں بلکہ میٹھے لفظوں کا استعمال کریں تاکہ لوگ آپ سے دور ہونے کے بجائے قریب ہوں، یہ نصیحت خواتین کیلئے نہیں ہے کیوں کہ وہ میٹھے بول بولیں تو مرد حضرات نہ صرف لٹو ہونے بلکہ زیادہ ہی قریب ہونے کا خدشہ ہے، سائنس کہتی ہے کہ بعض اوقات مرچیں کچھ کیے بغیر بھی لگ جاتی ہیں جیسے اگر بہو بہت اچھی ہے اور شوہر اس کا بڑا خیال رکھتا ہے تو ساس کو مرچیں لگ جائیں گی، اگر شوہر اپنی بیوی کی بجائے اپنے موبائل کو زیادہ دیکھے تو بیوی کو مرچیں لگ جائیں گی، بعض اوقات کچھ نہ کہا جائے تو مرچیں لگ جاتی ہیں جیسے اگر بیوی

کھانا اچھا پکائے، اچھے کپڑے پہنے اور شوہر تعریف نہ کرے تو بیوی کو کافی زیادہ مرچیں لگتی ہیں، شوہروں سے گزارش ہے کہ اپنی اکلوتی بیویوں کا خیال رکھیں کیوں کہ آج کل شادی ہو جانا بڑی غنیمت ہے، جس طرح مرچوں کی زیادتی صحت کیلئے نقصان دے ہے اسی طرح زبان سے نکلے لفظوں میں مرچیں رشتوں میں دراڑ ڈال دیتی ہیں۔

پرنس کی کتاب "ٹھنڈی مرچیں" سے اقتباس

پرنس کی محاروں کی کتاب

بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی صحیح

پرنس گھر میں سو رہے تھے اچانک آہٹ سن کر اٹھے تو ایک چور کو دیکھا جیسے ہی پکڑنے کیلئے لپکے تو اس کی لنگوٹی ہاتھ میں آگئی، اب پرنس وہ لنگوٹی رات کو خود پہن کر سوتے ہیں۔

بھینس کے آگے بین بجانا

پرنس ایک بار گھر میں بھینس لائے، اصلی دودھ پینے کا شوق تھا، صبح کوشش کرتے رہے لیکن بھینس دودھ دینے کا نام نہیں لے رہی تھی، اچانک انہوں نے بین بجانا شروع کردی اور حیرت انگیز طور پر بھینس نے چالیس کلو دودھ دے ڈالا اور یہ ٹوٹکا کئی بار پرنس نے استعمال کیا۔

گھر کی مرغی دال برابر

پرنس ایک دوپہر کچن میں گئے تو دیکھا کہ جو مرغی وہ لائے تھے وہ شیلف پر دال کے برابر پڑی تھی انہوں نے غصے میں اپنی بیگم کو کہا کہ ارے اتنی مہنگی مرغی ہے اور تم کو شرم نہیں آتی کہ دال کے برابر رکھی ہے۔

(غیر مساوانہ سلوک کی انتہاء ہے)

بندر کیا جانے ادرک کا سواد

پرنس ایک بار اپنے بھتیجے کے ساتھ چڑیا گھر گئے، بندر کے پنجرے کے آگے کھڑے تھے اچانک انہیں خیال آیا کے جیب میں ایک ادرک پڑا ہے، بندر کے آگے کر دیا، اس نے فوراً منہ میں ڈالا کچھ لمحے بعد برا سا منہ بنایا اور تھوک کے چلا گیا۔

اینٹ کا جواب پتھر سے

پرنس ایک مرتبہ چھت پر کھڑے تھے، انہوں نے ہمسائی کو لائن ماری لیکن جب کوئی اثر نہ ہوا تو پتھر دے مارا، جواب میں لڑکی نے پاس پڑی اینٹ مار کر ان کا سر ہی پھوڑ ڈالا تب سے پرنس نے چھت پر جانے سے توبہ کر لی۔

ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینا

ایک دن پرنس کھانا کھا رہے تھے اس دوران ایک مکھی نے ناک پر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش ناکام ہو جاتی، آخر تھک ہار کر وہ برا بھلا کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

ادھار محبت کی قینچی ہے

پرنس نے ایک بار اپنے دوست سے ادھار لیا وقت پر نہ دے سکے دوست نے بہت برا بھلا کہا اور بولا کہ پیسے واپس دو، پرنس نے پر نم آنکھوں سے اسے قینچی دے دی اور بولے کہ اس کو رکھو اب میری تمہاری محبت ختم ہو گئی ہے۔

پرنس کی کتاب "الو کا پٹھا" سے اقتباس

پاپ بیتی

مشتاق احمد یوسفی نے کسی کی آپ بیتی احمد فراز کو بذریعہ ڈاک بھجوائی اور ساتھ میں ایک سطری رقعہ لکھا:

''مطلوبہ آپ بیتی ارسالِ خدمت ہے، سنائیں آپ اپنی ''پاپ بیتی'' کب لکھ رہے ہیں؟؟

عثمانی بلوچ

ہم اور ہمارا سیاسی قد

ہمارا سیاسی قد کتنا بڑا ہے اس پر میڈیا تو بحث نہیں کر پائے گا۔۔کیونکہ نہ ہم دھاندلی کو پسند کرتے ہیں نہ ہی ہم شفاف الیکشن کے ذریعے کامیابی حاصل کرتے ہیں۔۔سو آج ہم اپنے سیاسی قد کے متعلق خود بتائیں گے کہ سیاسی قد کیا ہوتا۔۔یہ وہ قد ہوتا ہے جو انسان کے اندر بے ایمانی کو فروغ دے۔۔اس کی پیائش کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے کیونکہ اس حوالے سے ہمارا سیاسی قد بہت بڑا نکلے گا۔۔البتہ ہمارا جو ذاتی قد ہے وہ گنجے پن کی وجہ سے درمیانہ ہے اور کرکٹ کھلتے ہوئے یہ چوڑا ہو جاتا ہے۔۔البتہ تقریر کے وقت یہ دھاڑیں ضرور نکال سکتا ہے۔۔ہم نے سوچا کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے ہمارا سیاسی سفر با آسانی آسمانوں کو چھو سکے سو ہم نے ایک جرنیل کی طرف دیکھا۔۔اس کی طرف سے جواب نہیں آیا کیونکہ یہ اخبار میں چھپی ہوئی تصویر تھی۔۔تصویریں بولتی ہیں لیکن یہ تصویر خاموش تھی سو ہم چپ ہو گئے۔۔پھر ذہن میں خیال آیا کیوں نہ خطابت سیکھ کر کسی سیاسی پارٹی کی مسجد میں خود کو ایڈجسٹ کیا جائے۔۔یہ بات کارگر ثابت ہوتی اگر عین موقعے پر دھرنے والی سرکار درمیان میں نہ آتی کیونکہ ہم دھرنے دے نہیں سکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابا نے سختی سے منع کیا ہوا ہے بیٹے اگر دھرنے دے گا تو تیری شادی وسائی ہمسائی سے نہیں ہونے دوں گا سو ہم چپ سادھے رہے کیونکہ وسائی تو جان ہے اپنی۔۔اب ذہن میں یہی ترکیب آئی کہ ہم زورِ خطابت چوکوں پر آزمائیں اور اپنی حماقتوں کا عوام کو دلدادہ بنائیں۔۔سو ہم نے خانہ خراب سے رابطہ کیا کہ ایک جلسہ ہے جس میں آپ مہماں خصوصی ہوں گے اس لیے اپنا کلام خصوصی لکھ کر لائیں اور یہ بات بھی ہے کہ اس کے اندر خطابت کے شہنشاہ پاگل بادشاہ اپنے جوہر حماقت دکھائیں گے۔۔تو نہ صرف خانہ خراب نے حامی بھر لی بلکہ ساتھ یہ بھی کہا قبلہ آپ تکلیف نہ کریں سارے بندوبست میں خود کروں گا۔۔کیونکہ یہ پہلا موقع ہے جب ہم بھی کسی سٹیج پر جلوہ افروز ہوں گے۔۔اور اس کے بعد خانہ خراب کا ہر روز فون آتا کہ میاں جلسہ ہوگا یا نہیں تو ہم تسلیاں دیتے کہ ہر صورت میں ہوگا گولیاں کھانی پڑیں تو کھائیں گے لیکن جلسہ ضرور ہوگا صرف سپیکر نہ پھٹیں کیونکہ ان کی خوفناک آوازوں سے جی گھبراتا ہے۔۔سو وقت مقررہ پر خانہ خراب اپنا دیوان گدھا ریڑھی پر لاد کر جلسہ گاہ میں

تشریف لائے ہم بھی تشریف لے گئے۔۔پہلے باری تھی خانہ خراب کی کلام پڑھنے کی۔۔اچانک مخالفین کی توپوں سے ٹماٹر اگلنے لگے تو اس صورت حال سے خانہ خراب اگر چہ گزرے نہیں تھے لیکن دیکھا ضرور تھا سو اس صورت حال کو ایک بے غیرت سی ہنسی منہ پر سجا کر کہا کہ پتہ ہے ٹماٹر مہنگے ہیں ان کی قیمتوں میں اضافے کو کنٹرول کریں گے اگر آپ ہمیں ووٹ دیں گے۔۔اس کے بعد ہمارے اندر خانہ خراب کو دیکھنے کی سکت نہیں رہی کیونکہ ادھار الیا ہوا سوٹ اپنی ستم ظریفی سنا رہا تھا۔۔اس کے بعد ہماری باری تھی سو ہم نے پہلے 1122 کو فون کیا اور بعد میں سٹیج پر جلوہ افروز ہوئے کیونکہ ہمارا وقت مقرر تک سائرن کی آواز سنائی دی تو ہم نے تقریر کو اختتام کی طرف لانا شروع کیا اختتام نہیں ہوا تھا ہمارے اوپر صرف ٹماٹروں کی نہیں بلکہ انڈوں کا پتھراؤ بھی شروع ہو چکا تھا۔۔سو ایک ہمدرد نے ہمیں اس گھمسان کے رن میں نکالا تو ہم نے کہا کیا بات ہے آپ تو ایک نیک انسان ہیں سو اس نے کہا کہ بس اس نیکی کا بدلہ یہی ہے کہ کسی کو بتانا نہیں ہم نے آپ کو نکالا ہے۔۔موصوف نے ہمیں 1122 کی گاڑی میں بیٹھا دی ہم نے اس محسن کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی 1122 کی ٹیم کا کہ انہوں نے بروقت کاروائی کر کے ایک ناحق خون بہنے سے بچا لیا۔۔ہم نے گھر کی راہ لی گھر کے نزدیک پہنچنے والے تھے ایک اخباری رپورٹر پہنچ گئے اور پوچھا کہ آپ کو مار پڑی ہے ہم نے سنا ہے میں نے کہا کہ یہ غیر ملکیوں کی سازش ہے وہ کہنے لگا کہ خانہ خراب نے پریس کانفرنس میں بتایا تو ہم نے کہا وہ را کا ایجنٹ ہے اسے کیسے محب وطن پسند ہوں گے۔۔اسی اثناء میں ایک آدمی نے آکر کہا کہ میرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔۔میری زبان سے نکلا کہ اس کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ ہے۔۔سو اس نے وہ حال کیا ہمیں ایک ماہ ہسپتال رہنا پڑا۔۔ایک نرس کے ساتھ پیار کے چکر میں ہمارا سیاسی سفر اختتام پذیر ہو گیا۔۔آج کل ہم ایک سرکاری نوکری کرتے ہیں موبی لنک کے ٹاور سے پرندے اڑاتے ہیں۔۔اور ابھی تک کنوارے کیونکہ غیر ملکی میڈیا نے اتنی شہرت دی کہ آج ہم خود اس شہرت سے پریشان ہیں۔

ایک دفعہ سر محمد یوسف نے اپنے گھر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی دعوت کی۔۔چونکہ یو۔پی کے لوگ اپنے ہاں سالن وغیرہ میں مرچ مسالہ تیز رکھتے ہیں اور اس دن جو کھانا جوہر صاحب کو کھلایا گیا اس میں کھٹائی اور مرچ مسالہ کچھ زیادہ ہی تیز تھا۔۔سر محمد یوسف خود بیمار ہو گئے۔۔انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کو فون کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ "بیت الخلاء" میں ہیں۔۔اس صورت حال کا سر محمد یوسف نے ان ٹوٹے پھوٹے اشعار میں بیان کیا ہے۔

شکم پر ہاتھ رکھ کر یوسفِ بیمار بیٹھے ہیں
کاوچ پر پیر پھیلائے ہوئے لاچار بیٹھے ہیں
کھٹائی اور مرچ نے لطف ایسا کردیا پیدا
کہ انجن کی طرح مولانا آتش بار بیٹھے ہیں
در بیت الخلاء پر آج ہم لوگوں کی محفل ہے
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بس اور بے بس

خادم حسین مجاہدؔ

عوامی بسوں کا حلیۂ مبارک کچھ یوں ہوتا ہے کہ یہ دور سے ڈھانچے، نزدیک سے کھڑلیاں اور اندر بیٹھنے کے بعد ڈربا لگتی ہیں البتہ منزل پر پہنچنے کے بعد ان کے گدھا گاڑی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے انسانوں کی طرح ان کا ''باطن'' بھی ''ظاہر'' سے زیادہ خراب ہوتا ہے۔ اگر ''باطن'' پر نظر دوڑائیں تو آئین سے زیادہ پھٹی ہوئی گدیوں والی غریب عوام کے دل سے زیادہ ٹوٹی ہوئی سیٹیں دکھائی دیں گی جن پر بیٹھنے کے بعد ہر جمپ پر کسی کونے کھدرے سے کوئی کیل آدھے انچ تک جسم میں گھس کر عوام کو غافل ہونے سے محفوظ رکھتی ہے صحت وجسمانی تعلیم کے طلبا اگر سر کے بل کھڑے ہونے کی مشق کرنا چاہئیں تو اس کے لئے ان کو صرف پشت گاہ سے ٹیک لگانا پڑے گی۔ گرد وغبار کا قیمتی غازہ ہر مسافر کو وافر مقدار میں فراہم کرنے کے لئے کھڑکیوں سے شیشے سیاست دانوں کے دلوں سے ایمان داری اور ملک سے امن و امان کی طرح غائب ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بس ہر دم ائیر کنڈیشنڈ رہتی ہے بس کے دروازے ارکان اسمبلی کے مزاج سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں۔ جو ہوا کے ذرا تیز جھونکے سے بس سے علیحدہ ہو سکتے ہیں اس لئے ان کی مدد سے بس میں سوار ہونے کی کوشش مہلک ثابت ہو سکتی ہے سمجھدار مسافر دروازوں کا کام کھڑکیوں سے لیتے ہیں بس کے اندر نہایت اہتمام سے ایک ٹائم پیس لگا ہوتا ہے۔ جس پر گیارہ بجے پانچ اور پانچ بجے گیارہ بج رہے ہوتے ہیں بس کے اندر جس حالت میں ادھر ادھر شعر درج ہوتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی کسی شاعر نے کسی پینٹر کی ہجو لکھنے کی جسارت کی ہوگی جس کا بدلہ وہ آج تک شعروں کا تیہ پانچہ کر کے لیتے ہیں اگر ان شعروں کا خالق ان کو دیکھ لے تو پینٹر کو قتل کر دے اور بس کو آگ لگا کر خودکشی کر لے۔

بس کے اندر جلی حروف میں یہ ہدایت درج ہوتی ہے کہ ''اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے شاید کہ یہ تیرا آخری سفر ہو۔ امر واقعی ہی ان میں سفر کرتے ہوئے ہر دم سفرِ آخرت ہونے کا چانس ہوتا ہے۔ عموماً بس کے ٹائروں کو خراب علاقوں میں کثرت آوارہ گردی کے سبب ''پھوڑے'' نکلے ہوتے ہیں جو عوامی حکومت کی زخمی سڑکوں اور سپیڈ بریکروں کے باہمی تعاون سے دوران سفر ایک مخصوص وقفے کے بعد فرحت بخش ہچکولے کا باعث بنتے ہیں انہی کے احترام میں ڈرائیور دوسرا اور تیسرا گئر استعمال نہیں کرتے جس سے بریک لگانے کا تکلف نہیں کرنا پڑتا اور ایکسڈینٹ کا خطرہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے جہاں تک اس کی رفتار کا تعلق ہے تو ایک مسافرانہ اندازے کے مطابق پیدل چلنے

والا بس کے مسافر سے تقریباً پانچ منٹ پہلے منزل پر پہنچ جاتا ہے کیونکہ یہ بیس کلومیٹر سفر کے دوران چالیس سٹاپ کرتے ہیں اور رفتار تو چیونٹی کو شرمندہ کرنے والی ہوتی ہے

بس میں تین چیزیں خصوصیت سے ہوتی ہیں آئینے جن کی مدد سے ڈرائیور ''سواریوں'' پر نظر رکھتا ہے کیسٹ پلیئر جس سے سواریوں کو زبردستی نا معلوم زبان کے گیت سنوائے جاتے ہیں ہارن جس سے راستہ لینے اور دینے کے علاوہ لوگوں کے کانوں کے پردے پھاڑنے کا کام بھی لیا جاتا ہے گرین پیس تحریک کرنے والے ان بسوں کو دیکھ کر اپنی ساری کوششوں کا رخ ان بسوں کے خاتمے کی طرف موڑ دیں گے کیونکہ ہارن ''گیت کی آواز'' لوگوں کے شور کے ساتھ بس کے آوارہ پرزوں کی بیک گراونڈ میوزک سے جو سماں پیدا ہوتا ہے وہ لوگوں کو حس سماعت سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے یہ بس اپنی مدد آپ کے زریں اصولوں پر عمل کرنے سے سٹارٹ ہوتی ہے بقول ضمیر جعفری مرحوم ''بہت کم اس خرابے کو خراب انجن چلاتا ہے عموماً زورِ دست دوستاں سے ہی کام آتا ہے

بس کا ناخدا ڈرائیور کہلاتا ہے۔ جو بعض اوقات خود کو پائلٹ کا لقب بھی دیتا ہے یہ سردیوں میں گرمیوں کا اور گرمیوں میں سردیوں کا لباس پہننے والی ایک رنگین شخصیت ہوتی ہے جس کا اصل کام تو سڑک اور ٹریفک پر نظر رکھتے ہوئے گاڑی چلاتا ہے مگر یہ عموماً سواریوں پر نظر رکھتے ہوئے گاڑی اللہ کے بھروسے پر چلانے کی کوشش کرتا ہے اور اس سلسلے میں زیادہ فکر مند نہیں ہوتا اس میں جذبہ ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اس لئے یہ عوام کا بہت خیال رکھتا ہے حتیٰ کہ اگر اسے میلوں دور سے کوئی آدمی آتا دکھائی دے یا کم از کم اتنا ہی علم ہو جائے کہ کوئی آدمی گھر سے سفر کے ارادے سے چل پڑا ہے تو بس روک دیتا ہے کہ کہیں وہ سفر سے محروم نہ رہ جائے اور منزل تک لیٹ نہ پہنچے۔ بعض لوگ وسعتِ قلب کا مظاہرہ نہیں کرتے اور ڈرائیور کی اس اعلیٰ ظرفی و مروت کو لالچ پہ محمول کرتے ہیں۔ دورانِ سفر بھی ڈرائیور حضرات ہر دو دو منٹ بعد چار چار منٹ سٹاپ کرتے ہیں حتیٰ کہ قبرستان کے نزدیک بھی بس روکنا ضروری سمجھتے ہیں کیا پتہ کسی نے فاتحہ پڑھنا ہو یا کوئی مردہ قبرستان ٹرانسفر کرنا چاہتا ہو یا بقول دلاور فگار

اِس غم میں کہ کوئی اور مل جائے سواری
ہر گورِ غریباں پہ ٹھہر جاتی ہے لاری

بس میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت کنڈیکٹر صاحب کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ ان کی مرضی کے بغیر بس اس طرح جنبش نہیں کر سکتی جس طرح بیوی کے حکم کے بغیر شوہر۔ یہ شہنشاہ آدمی ہر مسافر کو سیٹ کا وعدہ کر کے بس میں ٹھونس دیتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں بھری ہوئی بس بھی خالی ہوتی ہے ایک بات بہر حال تسلیم کرنا پڑے گی کہ بس میں جگہ ہو نا ہو اس کے دل میں بہت جگہ ہوتی ہے یہ ایسا با کمال شخص ہے کہ جس جگہ ڈنڈا بھی رکھنا محال ہو وہاں سالم بندے کو کھڑا کر دے گا۔ یہ ایسا جادوگر ہے کہ گاڑی کے اندر سیٹوں پر، درمیانی راستوں پر، دروازوں پر سیٹوں کی درمیانی جگہوں پر اور چھت پر مردوں اور عورتوں کو اس ترتیب اور سلیقے سے فٹ کرتا ہے بلکہ ان کی تہہ لگاتا ہے کہ ایک انچ بھی جگہ خالی نہیں بچتی یوں تیس، چالیس بندوں کے لئے بنائی گئی بس ڈیڑھ دو سو بندوں کے کام آتی ہے اور ملکی دولت بچتی ہے۔ سفر کے دوران کنڈیکٹر صاحب پھنس کر کھڑے لوگوں میں سے انتہائی حیرت انگیز طریقے سے راستہ بناتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں اور کرایہ وصول کرنے لگتے ہیں اس دوران وہ جو گفتگو فرماتے ہیں اس میں ۶۰ فیصد گالیاں ۳۰ فیصد دھونس دھمکی وعدے اور ۱۰ فیصد کام کی بات ہوتی ہے۔

بس کے مسافروں میں تیس فیصد سٹوڈنٹ ہوتے ہیں پاکستان کی شاید ہی کوئی بس ہو جو ان کے شر سے محفوظ ہو۔ سٹوڈنٹ چاہے سنگل پسلی اور ہوا سے اڑ جانے والا ہو بس میں آ کر حیرت انگیز طور پر شیر ہو جاتا ہے۔ گھر میں چاہے کبھی دال نہ گلی ہو کنڈیکٹر کو یوں تڑی لگاتا ہے جیسے بس خرید کر دے رکھی ہو، کنڈیکٹر بھی عموماً ان کو چھت پر ہی بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سٹوڈنٹ اور کنڈیکٹر کے تعلقات عموماً کشیدہ ہی رہتے ہیں اگر کبھی کنڈیکٹر کسی کاغذی سٹوڈنٹ کی شان میں گستاخی کر بیٹھے تو عموماً بس ڈرائیور اور کنڈیکٹر کا حلیہ ناقابلِ شناخت ہو جاتا ہے۔
سٹوڈنٹ ہر نسل، رنگ اور عمر کے پائے جاتے ہیں اور ان گناہگار آنکھوں نے تو چالیس، پچاس سالہ سٹوڈنٹ بھی دیکھے ہیں ممکن ہے وہ اس بات کے قائل ہوں کہ گود سے لے کر گور تک علم کے اصول کے تحت عمر بھر طالبِ علم ہی رہنا چاہیے اکثر سٹوڈنٹ اپنی ''غیر نصابی'' سرگرمیوں کی بدولت لڑکیوں کے سینڈل اور سواریوں کے جوتے کھاتے رہتے ہیں۔

سٹوڈنٹ کے بعد مسافروں کی اکثریت خواتین پر مشتمل ہوتی ہے سفر کے دوران خواتین وقت گزاری کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتی ہیں کچھ خواتین ایک دوسرے اور پھر تیسرے گھروں کے حالات پر بحث چھیڑ دیتی ہیں اس دوران کسی بات پر لڑائی بھی شروع ہو سکتی ہے جو ابتداً صرف دو خواتین کے درمیان ہوتی ہے لیکن تھوڑی دیر بحث کے بعد پوری بس کی خواتین دو دھڑوں میں بٹ جاتی ہیں پھر وہ گالیاں اور کوسنے ایجاد ہوتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ اس لڑائی سے نہ صرف ان خواتین کا بلکہ دوسرے مسافروں کا وقت بھی آسانی سے کٹ جاتا ہے اور دوسروں کے خانگی حالات کا علم مفت میں ہوتا ہے۔ یوں یہ بسیں معلومات کا بہترین ذریعہ بھی ہیں بس میں کچھ مرد حضرات بھی ہوتے ہیں لیکن ان کی سرگرمیاں زیادہ تر ٹکٹ خریدنے۔ خاموش رہنے، بچوں کو بہلانے اور خواتین کے لئے کھانا پانی لانے تک محدود ہوتی ہیں عموماً اس سلسلے میں سب سے مشکل میں وہ مرد ہوتے ہیں جو کسی خاتون کے ساتھ بطور ''محرم'' سفر کر رہے ہوں۔ کچھ محققین قسم کے مرد بس میں موجود خواتین کے مطالعے میں مصروف پائے جاتے ہیں یوں یہ بسیں عشق کے محدود میدان کا درجہ بھی رکھتی ہیں اور اغواہ اور فرار کے واقعات میں ان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن ان بسوں کی تیز رفتاری کے باعث اکثر اس قسم کی بیلیں منڈھے نہیں چڑھتیں اور دست اندازی پولیس اور عوام کارروائیوں پر منتج ہوتی ہے۔

اِن قریب المرگ بسوں کا ہیلتھ سرٹیفکیٹ ٹریفک پولیس والے مک مکا کے سنہری اصول کے تحت جاری کرتے ہیں جس کی میعاد عموماً ایک ماہ سے ایک سال تک ہو سکتی ہے اگر بس مالکان بروقت اس کی تجدید نہ کرائیں تو ان کی یاداشت دُرست کرنے کے لئے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو سڑک پر لٹا کر خاص طریقے سے یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔

خواجہ مجذوب الحسن غوری بڑے سینئر ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں...... مگر وضع قطع سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی مسجد سے اذان دے کر آ رہے ہیں...... سر پر چوگوشیہ ٹوپی، سرخ سفید رنگ، چہرے پر بھوری داڑھی، لمبا کرتہ، اٹنگا پاجامہ، بغل میں لٹکا ہوا کلام مجید......... مگر آپ مل جائیں تو سڑک ہی پر کھڑے کھڑے اپنی غزل سنانا شروع کر دیں گے اور غزل بھی وہ جس کے کم سے کم بہتر شعر ہوں گے......... لہراتا ہوا ترنم اور ترنم کے ساتھ لہراتے ہوئے ہاتھ بلکہ کبھی کبھی سارا جسم لہرا جائے گا اور غزل سناتے رہیں گے :

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہوگئی

ایک مرتبہ میں اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی ان کے ساتھ ان ہی کے موٹر پر جا رہے تھے، جسے وہ خود چلا رہے تھے۔ راستے میں غزل سنانا شروع کر دیا اور اسٹیئرنگ وہیل چھوڑ کر ہاتھ لہرانے لگے...... نتیجہ یہ کہ موٹر ایک کھڈ میں قلابازی کھا گئی...... شکر ہے کسی کو چوٹ نہیں آئی...... سب کپڑے جھاڑ کر کھڑے ہو گئے...... مجذوب صاحب نے پوچھا کہ ''چوٹ تو نہیں آئی''......... مولانا عنایت اللہ نے فرمایا ''اللہ نے بڑا فضل کیا''......... مجذوب صاحب نے کہا، تو اُس کا دوسرا مصرع یہ تھا کہ...............

ظفر ندیم وہرہ

ہم نے موٹر سائیکل خریدی

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب ابا جان نے ہمارا مطالبہ پورا کرنے پر نیم رضامندی ظاہر کر دی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ شرط بھی عائد کر دی کہ یہ کام دس ہزار روپے کے اندر اندر ہونا چاہئے اور گاڑی کی قیمت اس سے زیادہ ہرگز نہیں ہونی چاہئے کیونکہ بقول ان کے، اس منصوبے پر زیادہ خرچ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اگرچہ یہ شرط ہمارے لئے اتنی ہی ناقابلِ قبول تھی جتنی کہ حکومت کے لئے مڈٹرم الیکشن کرانے کی بات ہوتی ہے مگر کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ تھا اس لئے اُن کے فرمان پر ''آمین'' کہنا پڑا جبکہ ہم پر یہ بات مرکری بلب کی طرح روشن تھی کہ اس ہوش ربا مہنگائی میں جبکہ نئی سائیکل کی قیمت پچاس ہزار روپے کے ہندسے کو چھو رہی ہے، دس ہزار میں موٹر سائیکل خریدنے کا تصور کرنا گویا دن میں خواب دیکھنے کے مترادف ہے اگر قسمت اچھی ہو اور اتنی قیمت میں گاڑی ہاتھ آ جائے تو یہ بات کسی طور پر بھی معجزے سے کم نہیں ہوگی مگر، صاحب: وہ جو کسی نے کہا ہے کہ امید ہونے سے ہی بات بنتی ہے اگر امید نہیں ہے تو سب کچھ زیرو ہے۔

اس وقت ہمارے ہاں موٹر سائیکل خریدنے کے کئی طریقے رائج ہیں۔ پہلا اور سب سے آسان طریقہ تو یہ ہے کہ جیب میں موٹی رقم ڈالیں اور سیدھے سیدھے کسی شوروم پر پہنچ جائیں اور بل کٹوا کر نئی نویلی گاڑی کے مالک بن جائیں لیکن یہ طریقہ صرف ان لوگوں کو سوٹ کرتا ہے کہ جنہوں نے سوٹ پہن رکھا ہو اور جو لاکھوں کو ریزگاری شمار کرتے ہوں۔

دوسرا طریقہ یہ کہ موٹر سائیکل خریدنے کے لئے چلتے پھرتے دلالوں سے رابطہ قائم کریں اور اپنا مطلب نکالنے کے لئے ان کے نخرے اٹھائے جبکہ تیسرا اور

آخری طریقہ یہ ہے آپ ٹہلتے ٹہلتے موٹر سائیکلوں کے جمعہ پہنچ جائیں اور مطلوبہ قیمت ادا کر کے اپنی پسند کی موٹر سائیکل لے آئیں۔ چونکہ پہلے دونوں طریقے کافی وقت طلب تھے اس لئے ہم نے عوامی طریقہ آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

جب ہم موٹر سائیکل خریدنے کے لئے جمعہ بازار پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سڑک کے دونوں اطراف موٹر سائیکلوں کی لائنیں لگی ہوئی ہیں اور موٹر سائیکلیں یوں قطار اندر قطار رکھی ہیں کہ جیسے کسی غیر ملکی کے استقبال کے لیے عوام سڑکوں کے کنارے کھڑے ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو سڑک کے کنارے پارکنگ کے لئے جگہ نہیں مل سکی تھی، انہوں نے ملحقہ گلیوں پر یلغار جما لیا تھا۔ اس دلنشین سین کو دیکھ کر ہماری نظروں میں بکرا منڈی کا منظر گھوم گیا کہ جہاں پر بقر عید کے سیزن میں رنگا رنگ بکرے اپنے خریداروں کے انتظار میں چشم براہ کھڑے ہوتے ہیں ہم نے وقت ضائع کئے بغیر چاروں طرف نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔ اچانک ہماری نظر ایک خوبصورت موٹر سائیکل پر آ کر رک گئی جس پر رنگا رنگ اسٹیکر بڑی محنت سے سجائے گئے تھے۔ اس موٹر سائیکل کا مالک سیٹ پر آلتی پالتی مار کر یوں بیٹھا ہوا تھا کہ جیسے شادی ہال کے باہر ولیمہ کھانے والے حضرات دعوت چالو ہونے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔

ہم اللہ کا نام لے کر آگے بڑھے اور موٹر سائیکل کا گہری نظر سے جائزہ لینے لگے۔ ہم نے اسے چاروں طرف سے یوں گھوم گھوم کر دیکھا کہ جیسے درزی ناپ لیتے وقت گاہک کو چاروں طرف سے گھوم گھوم کر دیکھتے ہیں۔ اس رسمی کاروائی سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے شادی دفتر والوں کی طرح اِس کے مالک کا انٹرویو لینا شروع کر دیا کہ موٹر سائیکل کا کون سا ماڈل ہے، اس کا انجن کھلا ہوا ہے یا کمپنی کا سیل بند ہے اس کے کاغذات مکمل ہیں یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔اس نے بلا مبالغہ موٹر سائیکل کی ایسی ایسی خوبیاں بیان کی کہ جن کا شاید اس کے مالک کو بھی نہ ہوگا۔ بس یوں سمجھ لیں کے لمبی لمبی چھوڑنے کا ریکارڈ اس کے ہاتھوں ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ ہم سمجھ گئے کہ شکاری ہمیں پھنسانے کے لئے سنہری جال بچھا رہا ہے کیونکہ ان کا سارا کام ہیرا پھیری پر مشتمل ہوتا ہے گاہک سے کہا جاتا ہے کہ پپو موٹر سائیکل ہے، اس میں ایک آنے کا کام نہیں ہے اور مالک سے کہا جاتا ہے کہ موٹر سائیکل میں رکھا ہی کیا ہے، کسی طرح گاہک کو پھسلا لیں اور کمیشن کھری کر کے اپنی راہ لیں۔ اس کے بعد وہ جانے اور اس کا کام۔۔۔۔۔اس سے پہلے کہ ہم قیمت معلوم کرنے کے لئے بات چیت شروع کرتے اس نے اپنا ہاتھ ہمارے کندھے پر ٹکایا اور ہمیں لے کر ایک کونے کی طرف چل پڑا۔ ہم یہ سمجھے کہ مزاج آشنائی کا مقابلہ شروع ہونے والا ہے اس لئے ہمیں کھڈے لائن لگایا جا رہا ہے مگر ہماری غلط فہمی تھی اس وقت کافور ہو گئی جب اس نے سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے کہا۔

جنابِ من! مانگنے کو تو اس موٹر سائیکل کا مالک بیس ہزار مانگ رہا ہے لیکن چونکہ آپ ہمارے جاننے والے ہیں اس لئے میں آپ کی خاطر مار پیٹ کر ہزار پانچ سو کم کرا لوں گا،،،،،، بولو تو آفر دے دوں؟؟؟؟؟

ہم نے کان کھجاتے ہوئے کہا "لیکن یہ قیمت تو بہت زیادہ ہے اور ہمارا بجٹ اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اتنی مہنگی موٹر سائیکل خرید کر خود گھاس پھونس پر گزارہ کریں۔"

وہ خاص کاروباری انداز میں بولا۔ "میرے بادشاہ یہ موٹر سائیکل تو بہت سستی چھوٹ رہی ہے کیونکہ اس کا مالک ایف۔ ایکس لے رہا ہے وگرنہ آپ یقین کریں کہ اتنے پیسوں میں آپ کو ایسی اچھی موٹر سائیکل مل ہی نہیں سکتی۔"

تم کہہ رہے ہو تو یقین کر لیتا ہوں مگر ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارے پاس اتنے ریال نہیں ہیں۔"

تو آخر پتہ تو چلے کہ آپ کتنے پیسوں میں موٹر سائیکل خریدنا چاہتے ہیں؟؟؟؟؟" اس نے پانی کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ یہی کوئی دس ہزار کے آس پاس۔۔۔۔"

ہم نے شارٹ ہینڈ میں جواب دیا ہماری بات سن کر اس نے ایسی شکل بنائی جیسے اس نے کڑوا بادام کھا لیا ہو مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر بولا۔

''میں آپ کا مطب اچھی طرح سمجھ گیا آپ تھکی ہوئی موٹر سائیکل لینا چاہتے ہیں۔''

آج تک تو یہی سنتے چلے آئے تھے کہ انسان اور جانور کام کر کر کے تھک جاتے ہیں مگر آج پتہ چلا کہ موٹر سائیکلیں بھی تھکی ہوئی ہوتی ہیں ۔۔۔۔۔اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے شاگرد کو آواز دی اور کالے رنگ کی موٹر سائیکل لانے کو کہا شاگرد نے فوراً آرڈر کی تعمیل کی اور ایک کھٹارہ سی موٹر سائیکل کو کھیسٹتا ہوا یوں لایا کہ جیسے قصاب ضدی بکرے کو گھسیٹ کر لاتے ہیں اس نے موٹر سائیکل کو کھڑا کر کے اپنا پاؤں اسٹینڈ کی جگہ پر گھما کر جیسے ہی موٹر سائیکل کو چھوڑا ،اس کا ملبہ ہمارے اوپر گرتے گرتے بچا۔ پتہ چلا کہ موٹر سائیکل میں سرے سے اسٹینڈ ہی موجود نہیں ہے البتہ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کا مالک اسے کیسے پارک کرتا تھا؟ یا وہ اسے اینٹوں کے سہارے کھڑا کرتا تھا یا اس کے نیچے لکڑی کا گٹکا لگا دیا کرتا تھا۔ دلال نے خفت مٹانے کے لیے فوراً اس کی تعریف شروع کر دی اور اس کی ایسی ایسی خوبیاں بیان کر ڈالیں کہ جنہیں سن کر نہ صرف یہ کہ ہماری معلومات میں اضافہ ہوا بلکہ ہم عش عش کر اُٹھے جبکہ اصل صورت حال یہ تھی کہ موٹر سائیکل کی کوئی چیز سلامت نظر نہیں آ رہی تھی ۔اس کی سیٹ غریب کی جیب کی طرح پھٹی ہوئی تھی اور اس کی حالت اس قدر خستہ تھی کہ اس میں سے فوم باہر جھانک رہا تھا جبکہ رنگ و روغن ندارد تھا۔ باڈی پر جا بجا خراشیں نظر آ رہی تھیں ۔اس پر مستزاد یہ کہ انجن پھک پھک کر رہا تھا اور سلنسر سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ جب ہم نے موٹر سائیکل کی ٹرائی لینے کے لئے انجن اسٹارٹ کیا تو اس میں سے ایسی خوفناک آوازیں بلند ہوئیں کہ جو بالکل جھینگر سے ملتی جلتی تھیں جبکہ آدھے دھڑ کے سلنسر کی آواز ایسی تھی کہ جیسے ڈیزل والا ٹیوب ویل چل رہا ہو ٹائروں کی حالت قابلِ رحم تھی اور یہ قریب المرگ نظر آ رہے تھے۔ انجن پر اتنی مٹی جمی ہوئی تھی کہ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا کہ جیسے موٹر سائیکل میں انجن کی بجائے شہد کی مکھیوں کا چھتہ فٹ ہوا ہو۔۔۔۔۔ہم نے سوچا کیوں نہ لگے ہاتھوں اس کا تیل پانی بھی چیک کر لیا جائے۔ اس مقصد کے لئے جب ہم نے آئل گیج باہر نکالا تو پتہ چلا کہ انجن کے پیٹ میں سے آئل یوں غائب ہے کہ جیسے تاروں میں سے بجلی غائب ہوتی ہے۔ ہم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود ہمیں آئل نام کی کوئی چیز نظر نہ آئی ہاں ،البتہ ایک کالا دھبہ ضرور نظر آیا جو کہ تارکول سے اچھی خاصی مشابہت رکھتا تھا اسے آئل تو نہیں کہا جا سکتا تھا البتہ کالا پھسجر ضرور کہا جا سکتا تھا ۔اگر ہمارا اندازہ غلط نہیں تھا تو ہم یہ بات بے دھڑک کہہ سکتے تھے کہ جب سے یہ موٹر سائیکل کمپنی سے آئی تھی اس کے مالک نے اس کا تیل بدلنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی کہ مبادا کمپنی والے ناراض ہو جائیں کہ تم نے اس کا خالص آئل کیوں نکال باہر کیا۔

موٹر سائیکل میں سائیڈ شیشہ موجود ہونا تو دور کی بات ہے، اس میں اشارے تک سرے سے ہی موجود نہ تھے

یک نہ شد دو شد۔۔۔۔۔۔۔ایک تو موٹر سائیکل کا رنگ کالا کلوٹا ،اوپر سے چاروں انڈیکیٹر غائب ۔اس آڈیشن میں موٹر سائیکل یوں دکھائی دے رہی تھی کہ جیسے کوئی کنکٹا پہاڑی بکرا راستہ بھول کر شہر می گھس آیا ہو۔ تلاش بسیار کے باوجود چین کور کتے دونوں ڈھکن نظر نہ آسکے۔ خدا جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ہم نے موٹر سائیکل کا جائزہ مکمل کرنے کے بعد قیمت معلوم کی تو پتہ چلا کہ اس محبوبہ روزگار کھٹارے کے، مالک بارہ ہزار روپے مانگ رہے ہیں۔

ہمارے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی کہ کہاں وہ زمانہ تھا کہ پچیس روپے میں نئی نویلی موٹر سائیکل آجاتی تھی اور کہاں یہ نوبت آگئی ہے کہ بارہ

روپے میں گھسی پٹی اور کھچائی موٹر سائیکل مل رہی ہے کہ جس کی نہ ماں کا پتہ ہے نہ باپ کا۔

اگر یہ موٹر سائیکل ہے تو پھر گدھا گاڑی کیا ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ یہ موٹر سائیکل ہماری پسند کے بالکل برعکس تھی مگر ''مجبوری کا نام شکریہ'' کے تحت اس سے نباہ کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اگر کاتب تقدیر نے ہماری قسمت میں یہی بھیڈ و لکھ دیا ہے تو ہم بھلا اِس تحریر کو کیسے بدل سکتے ہیں چنانچہ ہم نے شرم کو

بالائے طاق رکھتے ہوئے فوراً دلال سے مذاکرات شروع کر دیے جو کہ توقع کے مطابق نتیجہ خیز ثابت ہوئے اور تھوڑی سی آنا کانی کے بعد نو ہزار روپے میں سودا پکا ہوگیا۔ ہم نے قیمت ادا کرنے کے بعد موٹر سائیکل کو دستاویزات کو اپنے قبضہ میں لیا اور گیئر بدل کر گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

جب ہم سولو پرواز کرتے ہوئے کالونی میں داخل ہوئے تو وہاں کے لوگ ہمارے نیچے موٹر سائیکل کو دیکھ کر ہمیں یوں عجیب نظروں سے دیکھنے لگے کہ جیسے ہمارے سر پر دو چار سینگ اُگ آئے ہوں یا پھر ہمارے حلیے کا جغرافیہ تبدیل ہوگیا ہو۔ ایک صاحب تو ہمیں گھور گھور کر دیکھنے لگے جیسے ہم موٹر سائیکل پر سوار نہ ہوں بلکہ ہاتھی، گھوڑے یا اونٹ پر سوار ہوں۔ دراصل ان مورکھوں کو یہ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ہم ایک عدد موٹر سائیکل کے بلا شرکت غیرے مالک بن چکے ہیں اور اب اس تگڑی حقیقت سے انکار کرنا بہت بڑی جہالت ہے ہمارے ایک رقیب خاص جو کہ غیر معینہ مدت سے ہماری قابلیت اور لیاقت سے حسد کرتے چلے آرہے تھے، ہمیں شاہی سواری پر بیٹھا دیکھ کر مزید جل بھن کر کباب ہوگئے اور حسرت سے ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے جس سے ان کے نمونئے میں مبتلا ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا۔ دوسری طرف محلے کی عورتیں اور بچے ہمیں حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یوں تکنے لگے کہ جیسے ہم نے سر پہ سہرہ سجا لیا ہو۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ''کوئی جل گیا تو کسی نے دعا دی'' والا سین تھا۔

اس کیفیت سے دوچار ہونے کے بعد جب ہم تالیوں کے شور میں گھر کے قریب پہنچے تو ہم نے عوام کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے زور سے ہارن بجانے کی کوشش کی جو کہ بدقسمتی سے ناکام ہوگئی کیونکہ ہارن نے اپنی سریلی آواز سنانے سے انکار کردیا۔ ہم نے جھنجھلا کر اس کے بٹن کو زور سے کئی مرتبہ گدگدی کی مگر اس نے چوں تک نہیں کی۔ جب ہم نے غور سے دیکھا تو ہم پر یہ دلخراش انکشاف ہوا کہ گاڑی میں ہارن موجود ہی نہیں ہے، ہم خوامخواہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ مجبوراً ہمیں یہ کام زور زور سے ریس دے کر سرانجام دینا پڑا۔ جونہی گاڑی کی خوفناک آواز فضا میں گونجی، آس پاس کے لوگ گھبرا کر گھروں سے باہر نکل آئے اور وحشت زدہ ہوکر ادھر اُدھر دیکھنے لگے لوگوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ کہیں قریب ہی بجلی کا ٹرانسفارمر پھٹ گیا ہے اس سے پہلے کہ وہ مزید کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوتے، ہم نے چوک کھینچ کر (کیونکہ اس کا اسٹارٹ سوئچ سابقہ مالک نے بیچ کھایا تھا) اس کا انجن بند کیا اور اسے دیوار کے سہارے کھڑا کر کے غڑاپ سے گھر کے اندر داخل ہوگئے۔

ہمارے ہاں یہ روایت بن چکی ہے کہ جب کوئی انسان کوئی کارنامہ سرانجام دیتا ہے تو ہر آدمی اپنی بساط کے مطابق پھلجڑیاں چھوڑنا شروع کر دیتا ہے، چاہے اس کا اس معاملے سے تعلق ہو یا نہ ہو۔ کچھ حضرات کو اس کا کام پسند آتا ہے اور کچھ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے ہمیں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ادھر ہم موٹر سائیکل لے کر گھر سے برآمد ہوتے، ادھر لوگوں کے منہ کے دھانے یوں کھل جاتے کہ جیسے محاذِ جنگ پر توپوں کے دھانے کھلتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے لفظوں کی گولہ باری شروع ہوتی، کچھ لوگ اسے دیکھ کر دبے دبے سروں میں ہنستے تو کچھ باریک بین حضرات چن چن کر اسکی خرابیاں گنواتے۔ کچھ لوگوں کو اس کا بچا کھچا کلر پسند نہیں آتا تو کئی لوگوں کے کان انجن کی آواز سن کر کالے ہونے لگتے اور وہ فوراً اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیتے۔ کچھ ناعاقبت اندیش افراد اسے موت کے کنواں کے اندر چلنے والی پھٹ پھٹیا قرار دیتے تو کچھ حضرات اسے موٹر سائیکل تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیتے۔ ایک صاحب نے تو حد کردی اور اسے موٹر سائیکل کی بجائے چلتا پھرتا کباڑ خانہ قرار دے دیا۔ ان کی زبان درازی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس بات پر شرط لگانے پر تیار تھے کہ ہم یہ گاڑی کسی جمعہ بازار سے خرید کر نہیں لائے ہیں بلکہ کسی کباڑی سے تول کے حساب سے لے کر آئے ہیں وگرنہ اس اونٹنی کی کوئی کل سیدھی ہوتی اور تو اور ہمیں دودھ سپلائی کرنے والے حاجی صاحب نے جب دیکھا تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جیسی کہ فلمی ہیروئن کو دیکھ کر ولن کے چہرے پر آتی ہے

کیونکہ ان کے زیرِ استعمال موٹر سائیکل اور ہماری موٹر سائیکل میں کوئی خاص فرق نہیں تھا بلکہ دونوں ایک دوسرے کی جڑواں بہنیں نظر آتی تھیں۔ ہم شاید یہ سوچ کر نہال ہوجاتے کہ جلد یا بدیر یہ موٹر سائیکل ان کے بچھے چڑھے گی اور اس طرح ان کے بیڑے میں ایک اور دانے کا اضافہ ہوجائے گا۔

جب ہم ایسی دل جلانے والی باتیں سنتے تو کچھ دیر کے لئے ہمارا موڈ خراب ہوجاتا اور منہ کا ذائقہ کڑکڑا ہوجاتا مگر دوسرے ہی لمحے ہم یہ سوچ کر نارمل ہوجاتے کہ اس سے کہیں پھٹیچر اور ناکارہ موٹر سائیکلیں سڑکوں پر چل رہی ہوتی ہیں بلکہ دوڑ رہی ہیں۔ اگر ان کا مالک کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں کرتے تو ہمیں اپنا جی چھوٹا کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ پھر بھلا موٹر سائیکل کی حالت ٹھیک کرنا یا سدھارنا کوئی مشکل کام بھی نہیں ہے کیونکہ موٹر سائیکل بہرحال، موٹر سائیکل ہوتی ہے، کوئی کراچی کے حالات نہیں ہیں کہ سدھر نہ سکیں۔

چھوٹے شہروں کے مقابلے میں بڑے شہروں کے مسائل بھی بڑے ہوتے ہیں کیونکہ بقول انگریزوں کے جتنا بڑا سر ہوتا ہے، اتنا بڑا سر درد بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر سواری ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کو حل کئے بغیر کوئی چین کی بانسری نہیں بجا سکتا۔ وہ شخص نہایت ہی خوش قسمت شمار کیا جاتا ہے کہ جس کے پاس اپنی ذاتی سواری موجود ہو۔ کیونکہ آج کل رکشوں اور ٹیکسیوں کے کرائے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ شیطان کی آنت بھی چھوٹی دکھائی دینے لگی ہے۔ اب ان کا کرایہ سن کر دل اچھل کر حلق میں آجاتا ہے۔ اور اچھے بھلے انسان کے ہسپتال جانے کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ موٹر سائیکل خرید لینے کے بعد ہمارا آمد ورفت کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو گیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی کئی نئے مسائل نے جنم لے لیا تھا۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ جسے دیکھو منہ اُٹھائے چلا آرہا ہے کہ خدا کے واسطے ہمیں موٹر سائیکل چلانا سکھادیں، ہمارے بچوں کے بچے آپ کے بچوں کو دعائیں دیں گے۔ کئی لوگوں کی بیقراری کا یہ عالم ہوتا تھا

کہ وہ ابھی اور اسی وقت کے فارمولے پر عمل پیرا نظر آتے تھے۔ ان لوگوں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ ہم نے یہ موٹر سائیکل اپنی سہولت اور آرام کے لئے خریدی ہے، نہ کہ عوام کو تربیت کی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے لی ہے۔ اگر بالفرض محال ہمارا ڈرائیونگ سکول کھولنے کا ارادہ ہوتا تو ہم اُس کے لئے علیحدہ سے اخبارات میں اشتہار دیتے۔ ہم انہیں لاکھ سمجھاتے کہ ابھی ہم خود اُڑنا سیکھ رہے ہیں اور ہمارا ہاتھ اتنا صاف نہیں ہے کہ ہم ماہر موٹر سائیکل سوار ہونے کا دعویٰ کرسکیں مگر صاحب، وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔۔۔۔ اُن کا ایک ہی نعرہ ہوتا تھا کہ آپ جیسی بھی اچھی بُری چلانا جانتے ہیں، ہمیں بھی سکھا دیں۔ ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے، ہم انہیں مزید مجبوریاں بتاتے تو وہ فوراً ناراض ہوجاتے اور چھوٹتے ہی یہ کہتے کہ ہماری نیت میں پتھر پڑے ہوئے ہیں اس لئے ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔

ایسے ہی ایک صاحب ہمارے پاس آئے اور موٹر سائیکل چلانا سیکھنے پر اصرار کرنے لگے۔ ہم نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ وہ کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور اپنے ساتھ ہماری بھی ہڈیاں تڑوانا چاہتے ہیں۔ اگر ہاتھ پاؤں تڑوانے کا اتنا ہی شوق ہے تو کسی پہلوان کی بیٹی کو چھیڑ دیں اور اپنا شوق پورا کرلیں، مگر مجال ہے جو اُن کے کانوں پر مچھر بھی رینگا ہو۔ یوں کی ایک ہی رٹ ہوتی کہ وہ ہر صورت میں موٹر سائیکل چلانا سیکھیں گے، چاہے اُن کے بازو پر پلستر ہی کیوں نہ چڑھ جائیں۔ جب ہم نے یہ دیکھا کہ وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آرہے ہیں تو ہم نے آخری داؤ استعمال کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، ہم آپ کو موٹر سائیکل چلانا سکھادیتے ہیں مگر آپ کو میری شاگردی اختیار کرنے کے لئے ایک کلو لڈو، ایک پگڑی اور پانچ سو روپے نقد لانا ہوں گے۔ ہمارا مطالبہ سن کر وہ گڑبڑا گئے اور حیرانگی میں ڈوبنے کے بعد کہنے لگے "یہ لڈو اور پگڑی والی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ شاگردی اختیار کرنے کے لئے نذرانہ ہوتا ہے مگر ایڈوانس وصول کرنے کی بات کچھ مغز میں نہیں آرہی"۔

”جب تم ایڈوانس کی رقم لے کر آؤ گے تو سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا“

”پھر بھی کچھ پتہ تو چلے کہ یہ رقم کس خوشی میں لی جا رہی ہے؟“

”اب تم نے پوچھ لیا ہے تو بتانا میرا فرض ہو جاتا ہے، تمہیں تو پتہ ہے کہ تم ابھی اِس میدان میں اناڑی ہو ظاہر ہے کہ جب تم موٹر سائیکل سیکھنا شروع کرو گے تو دو چار پٹخیاں بھی کھاؤ گے اس اٹھک بیٹھک کے نتیجے میں موٹر سائیکل کی جو ٹوٹ پھوٹ ہو گی تو اسی ایڈوانس میں سے پوری کی جائے گی۔۔۔۔ سمجھے یا پھر سمجھاؤں؟“

یہ فلٹر شدہ جواب سُن کر وہ ایسے بھاگے کہ جیسے ہم نے اُن سے ایڈوانس نہ مانگا ہو بلکہ خون کا عطیہ مانگ لیا ہو۔ ہم اُنہیں لاکھ آوازیں دیتے رہے کہ اگر یہ رقم کچھ زیادہ ہے تو باہمی مشورے سے اس میں کمی کی جا سکتی ہے مگر انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ دراصل ان کا تعلق مفت خورہ گروپ سے تھا اور وہ کچھ خرچ کیے بغیر یہ فن سیکھنا چاہتے تھے۔ اس صاف گوئی سے ہمیں دو فوائد حاصل ہوئے۔ اول یہ کہ انہوں نے دوبارہ کبھی ہم سے ڈرائیونگ سیکھنے کی فرمائش نہیں کی اور دوسرے یہ کہ ہم سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا جس سے موٹر سائیکل پر سواری کے خواہشمند افراد میں ایک سکور کی کمی ہو گئی۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ میاں کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے اور اس کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس بات کا عملی ثبوت ہمیں اس وقت ملا جب ہم ایک عدد موٹر سائیکل کے مالک بن گئے۔ اِدھر ہمارے قبضے میں آئی، اُدھر ہمارے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ اب جسے دیکھو ہمیں ملنے چلا آ رہا ہے۔ جو لوگ ہم سے دعا سلام لینا بھی گناہ سمجھتے تھے، وہ اب ہمارے آگے پیچھے دم ہلاتے پھرتے تھے۔ اکثر لوگ ہم سے تعلقات بڑھانے کی فکر میں دبے ہوئے جا رہے تھے۔ اِن فصلی بٹیروں میں ایک بٹیرا ایسا بھی تھا کہ جس کی ٹھونگوں نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کبھی ان کی بیگم بیمار ہو رہی ہیں تو کبھی بچوں کو گھمانے پھرانے کا شوق پرورش پا رہا ہے انہیں ہر کام کے لئے ہماری موٹر سائیکل کی ضرورت پیش آ جاتی۔ بعض اوقات تو ایسا ہوتا کہ پانچ منٹ کا کہہ کر تاریخ تبدیل کروا کے واپس آتے۔ اگر بہانہ لسٹ میں موجود نہ ہوتا تو بھی وہ ہمارا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نظر نہ آتے تھے۔ ہم جہاں بھی جانے کا پروگرام بناتے، وہ مینڈک کی طرح پھدک کر ہمارے پیچھے پڑ جاتے کہ چلو مفت کی سیر ہو جائے گی۔ جب ان کی کارستانیاں تکلیف دہ حد تک بڑھنے لگیں اور ہم دن رات سر درد میں مبتلا ہونے لگے تو ایک روز ہم نے انہیں سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک دن ہمیں اتفاق سے ایک کام کے سلسلے میں قریبی شہر جانا تھا۔ اِدھر ہم نے موٹر سائیکل نکالی، اُدھر وہ عینک والے جن کی طرح اچانک نمودار ہوئے اور موٹر سائیکل کا ہینڈل تھام کر یوں کھڑے ہو گئے کہ جیسے اِس موٹر سائیکل پر ان کی کچھ قسطیں واجب الادا ہوں اور وہ انہیں وصول کرنے کے لئے آئے ہوں۔ ہم نے ان سے جان چھڑانے کے کئی مجرب طریقے آزمائے مگر وہ چمگادڑ کی طرح چپک ہی گئے اور پیشہ ور گداگر کی طرح پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے ہم حیران تھے کہ انہیں یہ خبر کیسے ہو گئی ہے کہ آج ہم لانگ ڈرائیو پر جا رہے ہیں اور ان کے لئے سواری لوٹنے کا اس سے بہترین موقع شاید دوبارہ نہ آئے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق، ہم نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور منزلِ مقصود کی طرف چل پڑے۔ اتفاق سے اس روز موٹر سائیکل میں پٹرول کم تھا، ظاہر ہے لمبے سفر کے لئے یہ راشن ناکافی تھا۔ اچانک ہمارے دماغ میں ایک اچھوتا خیال آیا جیسے ہی ہم ایک پٹرول پمپ کے قریب پہنچے، ہم نے جھٹ سے موٹر سائیکل اندر داخل کر دی اور پٹرول لینے والوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ جونہی تیل ڈالنے والا ہماری طرف متوجہ ہوا ہم نے شانِ بے نیازی سے ٹنکی فل کرنے کا آرڈر دے دیا۔

جب بل دینے کی باری آئی تو ہم نے بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ تمام جیبوں کی اچھی طرح تلاشی لینے کے باوجود پھوٹی کوڑی بھی برآمد نہ ہوئی

کیونکہ ہم اپنا بٹوہ پہلے ہی کا غذات والے خانے میں ٹھکانے لگا چکے تھے۔ ہم نے اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے چہرے پر ایسی اداسی طاری کر لی جیسی کہ جیب کٹ جانے پر انسان کے چہرے پر نمودار ہوتی ہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ہم اپنا پرس واقعی ہی گھر بھول آئے ہیں اور اب ہماری عزت ان کے ہاتھ میں ہے تو وہ دل پر پتھر رکھ کر بل ادا کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس طرح بیٹھے بٹھائے ساٹھ روپے کی چٹی پڑ گئی۔ کچھ روز بعد جب انہیں ہمارے ترتیب شدہ اس ڈرامے کا پتہ چلا تو وہ ہم پر دل کھول کر ناراض ہوئے اور آئندہ کے لئے اس خیال سے ہمارے ساتھ آنے جانے سے توبہ کر لی کہ کہیں ہم یہ سین دوبارہ نہ قلمبند کر لیں۔

جو لوگ اس سواری کی حقیقت سے نا آشنا ہیں، وہ اسے بڑے عجیب وغریب ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ کچھ اسے شیطانی چرخہ کا نام دیتے ہیں تو کچھ اسے ہڈی توڑ مشین قرار دیتے ہیں خاص طور پر بزرگ حضرات تو اس سواری سے یوں ڈر بھاگتے ہیں کہ جیسے سرکس کا گھوڑا ہنٹر سے دور بھاگتا ہے انہیں ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر وہ اس پر بیٹھ گئے تو ضرور اپنی ہڈی پسلی تڑوا بیٹھیں گے اور چلنے پھرنے سے وہ معذور ہو جائیں گے۔

ایک بار ایک ایسی ہی بزرگ شخصیت سے ہمارا پالا پڑا موصوف ہمارے دور پار کے رشتہ دار تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہتے تھے چونکہ ہم بھی ایک کام کے سلسلے میں اسی طرف جا رہے تھے اس لئے زبردستی انہیں ہمارے پلے باندھ دیا گیا۔ ہم نے انہیں پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنے دھوتی کا کس کے لنگوٹ باندھا اور گاڑی پر سوار ہونے کے لئے یوں چھلانگ لگائی کہ جیسے وہ موٹر سائیکل کی بجائے گدھے پر سوار ہو رہے ہوں اسی کوشش میں ان کا نشانہ خطا ہو گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر گئے ہم نے انہیں سہارا دے کے اٹھایا اور موٹر سائیکل پر سوار ہونے کا صحیح طریقہ سمجھایا مگر نا تجربہ کار ہونے کی وجہ سے اس طریقے پر عمل نہ کر سکے اور یوں چھلانگ لگا کر ہمارے پیچھے بیٹھے کہ ان کی بگلے جیسی ٹانگیں ہماری پسلیوں میں گھس گئیں ہمیں یوں لگا کہ جیسے کسی نے پیٹھ میں راکٹ مار دیا ہو۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ان کا رخ ہماری مخالف سمت تھا، یعنی وہ کیریئر کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔

ہم نے دو آدمیوں کی مدد سے ان کا قبلہ درست کیا، اور سیدھا کر کے بٹھایا۔ یہ عمل مکمل ہوتے ہی انہوں نے فوراً ہمیں اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا اور اتنی مضبوطی سے انو کی لاک لگایا کہ جیسے ہم کہیں بھاگے جا رہے ہوں۔ اگر ان کا بس چلتا تو ہمیں اپنے ساتھ رسے سے باندھ لیتے اس کاروائی کے نتیجے میں ہمیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا ہم نے انہیں اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کو کہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ دراصل انہیں یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ اگر انہوں نے اپنی سلائی ڈھیلی کر دی تو گاڑی چلتے ہی دھڑام سے نیچے گر پڑیں گے۔ بڑی مشکل سے ہم نے انہیں اس بات پہ راضی کیا کہ ہم موٹر سائیکل اس قدر آہستہ چلائیں گے کہ جیسے سائیکل چلا رہے ہوں۔ اگر وہ ہمارے ہاتھ سے گر جائیں تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔

ہم نے اللہ کا نام لے کر موٹر سائیکل کو کک لگائی۔ سوئے ہوئے انجن نے چند ہچکیاں لیں اور بھڑ بھڑ کرتا ہوا اسٹارٹ ہو گیا۔ جونہی اس کی خوفناک آواز گونجی، انہوں نے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا۔ ہم کھڈوں اور سپیڈ بریکروں سے بچتے بچاتے موٹر سائیکل چلانے لگے جبکہ انہوں نے قرآن خوانی کا آغاز کر دیا۔ وہ بلند آواز سے آیات کا کریمہ پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہمیں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہم موٹر سائیکل پر سفر نہ کر رہے ہوں بلکہ جنازے کے جلوس کے ساتھ چل رہے ہوں۔ خدا خدا کر کے سفر تمام ہوا، ادھر ہم نے بریک پر پاؤں رکھا ادھر انہوں نے بے صبری سے چھلانگ لگا دی کہ جیسے وہ گدی کی بجائے کسی گرم لوہے پہ بیٹھے ہوں۔ اسی کوشش میں ان کی دھوتی کیریر میں الجھ گئی اور وہ مکمل طور پر برہنہ ہونے سے بچ گئے اس سے پہلے کہ یہ سین خطرناک شکل اختیار کرتا، وہاں پر کھڑے ہوئے چند لڑکے فوراً آگے بڑھے اور عزت واحترام کے ساتھ ان کی الجھی ہوئی دھوتی کو چھڑایا، اس قید سے آزاد ہوتے ہی وہ گھر کی طرف یوں بھاگے کہ جیسے ان کے

پیچھے باؤلا کتا لگا ہو۔

کچھ افراد کو بچپن سے ہی سے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہوتا ہے اور وہ اس شوق کی تسکین کے لئے دن رات اپنے احباب کو فلمی ڈائیلاگ سنا کر کان کھاتے رہتے ہیں جبکہ ہمارا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ہمیں اداکاری کی بجائے بچپن سے ہی فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ شوق اس قدر شدید نوعیت کا تھا کہ جب تک ہم ہفتے میں چار چھ فلمیں نہ دیکھ لیں، ہمارا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا چنانچہ ہمیں اپنے معدے کی اصلاح کے لئے اکثر سینما گھروں کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔ان دوروں میں ہمارے کلاس فیلو ہمارا بھرپور ساتھ دیتے اور ہمیں کبھی بھی مایوس نہیں کرتے تھے۔ ادھر ہمارے پاس ذاتی سواری کا بندوبست ہوا ادھر ہمارے دوروں میں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوگیا، جس سے سینما ہالوں کی رونق مزید بڑھنے لگی جبکہ ہمیں فلم بینی کے لئے بجٹ فراہم کرنے کے لئے نت نئے بہانوں کا سہارا لینا پڑتا۔کبھی بلاٹنگ پیپر کی خریداری کے نام پر معقول رقم بٹور لی جاتی تو کبھی کالج میں فنکشن کے نام پر چندہ لے لیا جاتا، کاپیوں اور کتابوں کے پھٹ جانے یا گم ہونے کے بہانے اس کے علاوہ ہوتے ان بدعنوانیوں میں صرف ہم ہی ملوث نہیں ہوتے تھے بلکہ کالج کے سو فیصد سٹوڈنٹ ان خوشنما ہتھکنڈوں کا باقاعدہ بلکہ آزادانہ استعمال کرتے تھے۔

ایک بار اپنے گہرے دوست ریاض عرف کمانڈو کی دعوت پر فلم کا آخری شو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔چونکہ آخری شو رات کو بارہ بجے کے قریب اختتام پذیر ہوتا تھا اس لئے ہم دونوں نے گھر پر یہ ٹریلر چلایا کہ ہم عزیز میاں کی قوالی سننے کے لئے لطیف آباد جا رہے ہیں اور رات کو ذرا دیر سے لوٹیں گے۔ یہ جھوٹ اتنا خوبصورت تھا کہ کسی نے ہماری نیت پر شک کرنے کی جرأت محسوس نہیں کی ہم اپنی اس عظیم الشان کامیابی پر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔

رات بارہ بجے کے قریب جب ہم فلم دیکھ کر گھر جا رہے تھے تو اس وقت روڈ بالکل سنسان تھی، صرف اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں اچانک کمانڈو نے ہمیں موٹر سائیکل کا ایکسلیٹر دبانے کا مشورہ دیا ہم نے فوراً موٹر سائیکل کو تیز دوڑانا شروع کر دیا۔ انجن نے خوفناک آوازیں نکالنا شروع کر دیں ارنٹ بولٹ توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا مگر ہم نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور فائر بریگیڈ والوں کی طرح گاڑی دوڑاتے رہے۔اب ہم نیچی پرواز کر رہے تھے اس موقع پر موٹر سائیکل نے اچھل کود کا خوب مظاہرہ کیا اور ایک دو مرتبہ سلپ ہوتے ہوتے بچی مگر اس وقت چونکہ ہم شیطان کی تحویل میں تھے اس لئے ان باتوں سے بے نیاز ہو کر محوِ پرواز رہے۔جب ہم مچھلی مارکیٹ کے قریب پہنچے، اچانک ایک گلی میں سے دیسی کتوں کا ایک غول نعرے لگاتا ہوا برآمد ہوا اور ہم پر حملہ آور ہو گیا۔

ہم اس اچانک شب خون کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ان کم بختوں نے چاروں طرف سے ہمیں گھیر لیا اور اچھل اچھل کر حملے کرنے لگے۔ہم حیران تھے کہ ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے کہ جس کا قرض وصول کرنے کے لئے انہوں نے چڑھائی کر دی ہے؟۔۔۔۔ہم نے ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے موٹر سائیکل کی رفتار مزید تیز کر دی مگر کتے آخر کتے ہوتے ہیں، بھلا وہ کب ہار ماننے والے تھے؟انہوں نے بھی ایکسلیٹر بڑھا دیا اور موٹر سائیکل کے شانہ بشانہ دوڑنے لگے ان کا جوش و خروش دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ ہمیں کسی قسم کی رعایت دینے پر تیار نہیں ہیں۔ اچانک ایک کتے نے پیلنٹی کارنر کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کمانڈو کی پتلون کا پائنچہ منہ میں دبوچ لیا اور پوری قوت سے اپنے طرف کھینچنے لگا اس کام کو مکمل کرنے میں اس کے تیز دانتوں نے اس کی بھرپور مدد کی اور وہ پائنچے کی دھجیاں بکھیرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس اچانک افتاد سے ہمارے ساتھی اتنے بدحواس ہوئے کہ انہوں نے چلتی موٹر سائیکل سے چھلانگ لگا دی مگر موٹر سائیکل کی رفتار کافی تیز تھی اس لئے وہ فٹ بال کی طرح لڑھکنیاں کھاتے ہوئے نہ صرف یہ کہ خود گر گئے بلکہ ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے'' کے مصداق ہمیں بھی سڑک پر بچھا دیا۔ جیسے ہی موٹر سائیکل ہمارے کنٹرول سے باہر ہوئی، وہ اسکیٹنگ کرتی ہوئی روڈ سے نیچے اتری اور قریب کھڑے ہوئے ایک تانگے کے

چرنوں میں جا کر ڈھیر ہوگئی۔

اس کے گرتے ہی کتے خوفزدہ ہو کر یوں بھاگے کہ جیسے ان پر بجلی گر پڑی ہو۔ تانگے کا کوچوان جو کہ تانگہ اسٹینڈ کے شیڈ میں بیٹھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مزے سے چرس پی رہا تھا، دوڑ کر باہر نکلا اور گھوڑے کے ہاتھ پاؤں چیک کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ موٹر سائیکل کے گھوڑے کے ساتھ ٹکرا جانے کے نتیجے میں گھوڑے کو چوٹیں آئی ہوں گی اور وہ انہی زخموں کو بنیاد بنا کر کچھ رقم بٹورنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کی خود غرضی دیکھ کر ہمیں اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر افسوس ہونے لگا ہمیں یہ یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ کوچوان پچھلے جنم میں فرعون کے قبیلے میں شامل رہا ہے ورنہ وہ جانور کی فکر کرنے کی بجائے انسانوں کا حال احوال پوچھتا جو کہ اپنے گوڈے گٹے چھلوا کر سڑک پر بے یار و مددگار پڑے تھے۔ اس نازک موقعے پر ایک دفعہ پھر ڈاکٹر علامہ اقبال کے افکار ہمارے کام آئے اور ہم ہمتِ مرداں مددِ خدا کا نعرہ لگاتے ہوئے پہلے خود اُٹھ کر کھڑے ہوئے پھر کمانڈو کو سہارا دے کر یوں کھڑا کیا کہ جیسے طوفان میں گھر جانے والے ٹیلیفون کے کھمبے کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد موٹر سائیکل کو اس کے ٹائروں پر کھڑا کیا۔

جب ہم نے موٹر سائیکل کا سرسری طور پر جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ اس کریش لینڈنگ کے نتیجے میں اسے کافی نقصان پہنچا ہے اور وہ فراخ دلی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی ہے۔ مرے کو مارے شاہ مدار ہم پہلے ہی اس کھٹارے کو تھپکیاں دے دے کر چلا رہے تھے کہ اب ایک نئی مصیبت آن کھڑی ہوئی تھی۔ ہم نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو ہم پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ اس کے اسٹارٹ ہونے کی حس ختم ہو چکی ہے کیونکہ ککیں مار مار کر ہمارے پاؤں دوہرے ہو گئے مگر جاپان کی بچی نے اسٹارٹ ہونے سے صاف انکار کر دیا۔

یہ صورتحال دیکھ کر ہمیں یہ یقین کرنا پڑا کہ مستری کی مدد کے بغیر اس کا سانس بحال ہونا ممکن نہیں ہے۔ اب اسے لے جانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ اسے پیدل گھسیٹ کر لے جایا جائے۔ طے یہ پایا کہ آدھے راستے تک ہم اسے گھسیٹیں گے اور آدھے راستے کمانڈو اسے گھسیٹے گا۔ ہم نے اس پریڈ سے بچنے کے لئے چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ شاید ٹرانسپورٹ کا کوئی بندوبست ہو جائے اور ہم دھکے کھانے سے بچ جائیں مگر ٹائم اتنا زیادہ ہو چکا تھا کہ اس مردے کو لے جانے کے لئے ایمبولینس کا ملنا محال تھا۔ ہم نے اللہ کا نام لے کر آستینیں چڑھائیں اور موٹر سائیکل کو کان سے کھینچنا شروع کر دیا، کمانڈو اپنا نمبر بھگتاتے وقت موٹر سائیکل بھی کھینچ رہا تھا اور دل ہی دل میں موٹر سائیکل بنانے والی کمپنی اور کتوں کو گالیاں بھی نکال رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وگرنہ موٹر سائیکل کو قریبی گندے نالے میں دھکا دے کر فرار ہو جاتا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہمارے گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے ،صرف ایک کلومیٹر کا فاصلہ تھا

اب ہمارے سامنے سب سے اہم اور فوری مسئلہ یہ تھا کہ اس حادثے کو عوام الناس کی نظروں سے کیسے چھپایا جائے۔ ہم نے احتیاطی تدابیر کے طور پر اس پر کپڑا ڈال کر اسے کیموفلاج کر دیا تھا مگر یہ حل دیرپا نہیں تھا کیونکہ پردہ اُٹھتے ہی بھانڈہ پھوٹ جانے کا چانس موجود تھا۔ ہمیں دوسروں کی تو کوئی خاص پرواہ نہیں تھی اگر ڈر تھا تو صرف ظلِ سبحانی کا تھا کیونکہ انہوں نے گاڑی خریدتے وقت ہی وارننگ دے دی تھی کہ اگر ہمارے ہاتھوں کسی قسم کا بھی حادثہ رونما ہو گیا تو وہ موٹر سائیکل کا آخری دن ہوگا اور وہ کوئی مہلت دئے بغیر اسے فروخت کر دیں گے۔۔۔۔ ہم یہ سوچ سوچ کے پاگل ہوئے جا رہے تھے کہ اگر موٹر سائیکل ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی تو ہمارے پاؤں کے نیچے سے گویا زمین کھسک جائے گی اور ہم دوستوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے کافی مغزماری کے بعد یہ حکمت عملی سمجھ میں آئی کہ انکے بیدار ہونے سے پہلے پہلے موٹر سائیکل کو مستری کے پاس پہنچا دیا جائے تا کہ وہ جلد از جلد اس کی مرہم پٹی کر کے اسے چلنے کے قابل بنا دے۔ چنانچہ جونہی صبح ٹی وی پر صبح کی نشریات شروع ہوئیں ، ہم دبے پاؤں بستر سے منقی ہوئے اور ہاتھ منہ دھوئے اسے گھسیٹ کے مستری کے پاس لے گئے۔ چھینا مستری اس وقت پوری کھا کر گیراج کے اندر ہی سو رہا

تھا۔اس کے بمبار خراٹوں سے سارا گیراج گونج رہا تھا۔

ہم نے آ گے بڑھ کر رومال کی بتی بنائی اور آہستہ سے اس کی ناک میں گھسیڑ دی۔ اس نے پرانے انجن کی طرح دو چار چھینکیں نشر کیں اور بدحواس ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ یہ سمجھا کہ شاید نہار منہ گیراج میں ڈاکہ پڑ گیا مگر جب اس نے آنکھیں مل کے ہمیں دیکھا تو اس کا خوف جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ہم نے خوب مرچ مصالحہ لگا کر اپنی داستانِ غم سنائی اور مدد کی درخواست کی۔ ہماری رقت انگیز تقریر کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ وہ سارے کام چھوڑ کر ہمارا کام کرنے پر تیار ہو گیا۔ ہم نے فوراً پانچ سو کا ایک کرارہ نوٹ نکالا اور ایڈوانس کے طور پر اس کے حوالے کر دیا اس نے کنگلے ہیرو کی طرح نوٹ کو ایک زوردار بوسہ دیا اور اسے اپنی جیب میں قید کر لیا اور اس کے ساتھ ہی یہ خوشخبری دی کہ وہ شام تک موٹر سائیکل کو ہر حالت میں ریڈی کر دے گا اور ایسا اے ون کرے گا کہ کسی کو شبہ کرنے کا مرض لاحق نہیں ہو گا ،ہم یہ بات اچھی طرح سے جانتے تھے کہ اگر چہ وہ اُلٹی کھوپڑی کا مالک ہے مگر کام واقعی اتنی محنت سے کرتا ہے کہ شیطان بھی اس کے کام کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا، شام کو جب ہم موٹر سائیکل کی ڈیلوری لینے پہنچے تو اس وقت وہ بالکل تیار کھڑی تھی۔ اس نے تمام زخموں کا نہ صرف یہ کہ خوبی سے علاج کر دیا تھا بلکہ اپنے طور پر چند ایسی چیزیں بھی ڈال دی تھیں کہ جن کے نہ ہونے سے موٹر سائیکل لنڈروی دکھائی دیتی تھی۔اب اسے بجا طور پر ایک مکمل موٹر سائیکل کہا جا سکتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے یعنی پکاتا کھیر ہے اور پک دلیہ جاتا ہے۔ ابھی ہم اس حادثے کے اثرات سے سنبھلنے بھی نہ پائی تھے کہ ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

ہوا یوں کہ ہم صبح سویرے کالج جانے کے لئے گھر سے نکلے ہم اپنی دھن پر چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک گلی میں سے ایک بڑے میاں کہ جن کی ناک پر ہیوی قسم کا چشمہ بیٹھا ہوا تھا، لٹھ گھماتے ہوئے برآمد ہوئے اور اندھوں کی طرح سڑک پار کرنے لگے ان کی سپیڈ اس قدر تیز تھی کہ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ سڑک پار نہ کر رہے ہوں بلکہ پل صراط پار کر رہے ہوں۔اس پر ستم یہ کہ انہوں نے دائیں بائیں دیکھنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی اور یوں دندناتے ہوئے سڑک کے درمیان میں آ گئے کہ جیسے یہ روڈ ان کے باپ دادا کی ملکیت ہو۔ہم نے انہیں سنبھلنے کا موقع دینے کے لئے زور زور سے ہارن بجایا۔موٹر سائیکل کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی ۔یوں لگ رہا تھا کہ جیسے انہوں نے کانوں میں کوئی روئی ٹھونس رکھی ہو۔اُنکے تیور بتا رہے تھے کہ وہ جلد از جلد سڑک پار کرنا چاہتے ہیں، چاہے وہ اس کوشش میں اوپر ہی کیوں نہ پہنچ جائیں۔۔۔۔ہم بھی کسی ممکنہ حادثے سے بچنے کے لئے تیار ہو گئے۔جیسے ہی وہ ہمارے قریب پہنچے ہم نے ہینڈل کو ایک طرف گھمایا وہ بدحواس تو پہلے ہی تھے ہماری اس حرکت سے مزید بدحواس ہو گئے اور سڑک پر ڈانس کرنے لگے ہم دائیں طرف سے نکلنے کی کوشش کرتے تو وہ بھی دائیں ہو جاتے ہم بائیں سے نکلنے کی کوشش کرتے تو وہ بھی بائیں طرف ہو جاتے، عجیب تماشہ تھا۔لگتا تھا بڑے میاں آج کوئی نہ کوئی حادثہ فرما کر جانے کی نیت سے گھر سے نکلے ہیں۔ ہم نے درمیان میں سے راستہ بنا کر نکلنے کی کوشش کی مگر بے سود انہوں نے اپنی لاٹھی کو اتنے زور سے گھمایا کہ وہ اگلے پہیے میں پھنس کر رہ گئی ۔اِس اچانک افتاد سے موٹر سائیکل یوں لہرائی کہ جیسے کوئی کیلے کے چھلکے سے پھسل جانے کے بعد لہراتا ہے، ہم نے اپنے طور پر سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔موٹر سائیکل بڑے میاں سے ٹکراتی ہوئی فوراً زمین بوس ہو گئی جس کے نتیجے میں وہ ہم سے یوں بغل گیر ہو گئے کہ جیسے ہم نے ان سے عید ملنے کی درخواست کی ہو۔

اس ''ملن''میں ان کا چشمہ ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ادھر بڑے میاں نے گرتے ہی چلانا شروع کر دیا۔اور حلق سے ایسی ایسی آوازیں نکالنے لگے کہ جیسے وہ چھری تلے آئے ہوں ۔ہم نے جب ان کے ماتھے کی طرف دیکھا تو وہاں پر آلو کی برابر ایک سپیڈ بریکر نظر آیا ہم نے انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت انہیں زمین سے اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ مزید بپھر گئے اور کاٹنے کو دوڑنے لگے۔ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ حادثہ ہماری غفلت کے نتیجے میں ہوا ہے اور وہ اس کا حساب لیں گے۔۔۔جبکہ حقیقت اس

برعکس تھی۔ہم نے تو انہیں یہ نہیں کہا تھا کہ وہ ٹہلتے ہوئے سڑک پر آجائیں اور بھینس کی طرح سڑک پار کرنے کی کوشش کریں۔سارا قصور ان کا اپنا تھا مگر چونکہ ہم موٹر سائیکل پر تھے اس لئے غلطی ہمارے نام رجسٹر ہوگئی۔

ان کی چیخ پکار سن کر وہاں ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا اور معاملے کی چھان بین کرنے لگا۔لوگوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ ہم لاپرواہی سے موٹر سائیکل چلا رہے تھے اس لئے سارا قصور ہمارا ہی بنتا ہے جبکہ بڑے میاں کو ان کی بزرگی کا فائدہ دے کر صاف طور پر بچایا جا رہا تھا، جب انہوں نے دیکھا کہ ہوا اُن کے رخ پر چل رہی ہے تو وہ کلف شدہ کالر کی طرح مزید اکڑ گئے جس سے کہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں وہ اپنی پسلیاں نہ توڑ بیٹھیں۔اس سے پہلے کہ وہ ہماری جڑوں میں بیٹھ جاتے، ہم نے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ''غلطی'' تسلیم کر لی مگر وہ بکرم کی طرح اکڑ گئے اور سڑک کے درمیان دھرنا مار کر یوں بیٹھ گئے کہ جیسے بھوک ہڑتال کرنے والے افراد سرکاری دفتروں کے سامنے بیٹھتے ہیں یا پھر مریل بیل بچھڑ خانے کے گیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں۔اپنے کیس کو مزید مضبوط بنانے کے لئے انہوں نے چہرے پہ اُداسی کا نقاب چڑھا لیا اور ہفتوں کے بیمار مرغ کی طرح گردن لٹکا کر بیٹھ گئے۔ہم حیران تھے کہ ان کے جسم پر نہ تو کوئی سنگین توڑ پھوڑ ہوئی ہے اور نہ ہی کہیں سے خون کا قطرہ دریافت ہوا ہے، پھر یہ لوگوں کو تماشہ کیوں دکھا رہے ہیں۔ہمارے اندازے کے مطابق انہیں اس وقت تک سڑک کے اُس پار پہنچ جانا چاہئے تھا، آخر یہ کیوں خوامخواہ فلم چلانے پر تلے ہوئے ہیں۔

ابھی ہم اسی شش و پنج میں مبتلا تھے کہ کہ ہمارے قریب کھڑے ایک صاحب نے ہمارے کان میں آہستہ سے کہا کہ بڑے میں کو سو پچاس دے کر جان چھڑا لیں وگرنہ پرانا کمبل گلے پڑ جائے گا اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔۔۔۔ہم نے اس نیک دل انسان کا فوری شکریہ ادا کیا کہ جس نے بروقت ایک قیمتی مشورہ ہماری طرف بڑھا کر ہمیں پریشانی سے بچا لیا۔ہم نے ان کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرتے ہوئے فوراً جیب سے ایک لال نوٹ نکالا اور رشوت دینے والوں کی طرح چپکے سے ان کی مٹھی میں دبا دیا۔انہوں نے ہلکی سی مٹھی کھول کر نوٹ کا دیدار کیا اور اس کی موجودگی کا یقین ہو جانے پر کپڑے جھاڑتے ہوئے یوں کھڑے ہوئے کہ جیسے قوالی ختم ہو جانے پر قوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اب پتہ چلا کہ یہ سارا ڈرامہ کس لئے رچا رہے تھے۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ موٹر سائیکل خریدنا بہت آسان ہوتا ہے مگر اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت اتنی ہی مشکل ہوتی ہے جتنی کہ شادی کر لینے کے بعد بیوی کی۔دونوں کے ناز نخرے اٹھاتے اٹھاتے اچھا خاصا انسان ہاف پاگل ہو جاتا یا پھر کارٹون بن جاتا ہے کیونکہ دونوں کے ساتھ ہر وقت کوئی نہ کوئی مسئلہ جڑا رہتا ہے۔

جب موٹر سائیکل بگڑ جاتی ہے تو اس کا مزاج درست کرنے کے لئے مستریوں کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں۔اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو خرچہ کرتے کرتے کمر ٹوٹ جاتی ہے۔اس میں شک نہیں کہ جب سے ہم نے یہ موٹر سائیکل خریدی تھی، آمد و رفت کا مسئلہ یوں حل ہو گیا تھا کہ جیسے پانی میں چینی حل ہو جاتی ہے مگر پے در پے حادثات اور ٹکروں نے ہماری جیب میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔ہمیں پٹرول کا خرچ نکالنے کے لئے گھر والوں سے ایسے داؤ پیچ کھیلنے پڑتے تھے کہ جنہیں کوئی بھی شریف آدمی کھیلنا پسند نہیں کرتا۔مانگنے والوں نے الگ ہماری ناک میں دم کر کے رکھ دیا تھا۔کسی کی مرغی گم ہو جائے، کسی کا بچہ گھر سے بھاگ جائے، کسی کی بیوی بیمار پڑ جائے یا کسی کی جیب کٹ جائے، تمام باتوں کی تان موٹر سائیکل لے جانے پر آ کر ٹوٹتی تھی اس موٹر سائیکل نے ہمیں اچھا خاصا خدائی فوجدار بنا دیا تھا۔بعض اوقات تو ہمارا جی چاہتا تھا کہ اسے بکرا منڈی جا کر فوراً بیچ دیں اور روز روز کے بکھیڑوں سے آزاد ہو جائیں ''خس کم جہاں پاک''۔۔۔نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری''۔۔۔۔مگر پھر یہ سوچ کر رک جاتے تھے کہ اگر موٹر سائیکل ہاتھ سے نکل گئی تو ہمارا گزارہ کیسے ہوگا، پیدل چلتے چلتے تو ہم ٹائر کی طرح گھس جائیں گے اور دو ہی دنوں میں پتہ لگ جائے گا کہ آٹے دال اور بناسپتی گھی کا کیا بھاؤ ہے؟؟،،، چنانچہ مجبوری کا نام شکریہ کے فارمولے پہ عمل کرتے ہوئے ہم اسے چلا رہے

تھے۔

اسی دوران اتفاق سے ہمارا دس ہزار روپے کا انعامی بانڈ نکل آیا۔ ہم دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے کہ چلو قسمت کا پھاٹک کھل گیا۔ اب ہم اس پرانی موٹر سائیکل کو دھکا دے کر اور کچھ رقم اور ملا کر کوئی ڈھنگ کی موٹر سائیکل لے لیں گے جو کہ چار موٹر سائیکلوں میں کھڑے ہونے کے قابل تو ہوگی، اس طرح ہماری اچھی خاصی ٹور بن جائے گی۔ یہی سوچ کر ایک روز ہم انعامی بانڈ کی رقم لینے اسٹیٹ بنک پہنچے۔ ہم نے موٹر سائیکل پہنچے کھڑی کی اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے عمارت میں داخل ہو گئے۔ اگر چہ اس تیز رفتاری نے ٹی بی کے مریض کی طرح ہمارا سانس پھولا دیا تھا مگر انعام ملنے کی خوشی نے تکلیف کا احساس ختم کر دیا تھا۔ ہم نے جیب سے سلپ نکالی اور انعام حاصل کرنے والوں کی لائن میں شامل ہو گئے۔

اچانک ہمیں کھڑے کھڑے خیال آیا کہ ہم موٹر سائیکل کو لاک کرنا بھول گئے ہیں یہ خیال آتے ہی ہمارے رونگٹے ایک ایک کر کے کھڑے ہونا شروع ہو گئے جونہی یہ عمل مکمل ہوا، ہمارے ماتھے پر پسینے کی ریل پیل شروع ہوگئی کیونکہ یہ بات ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ موٹر سائیکل کو لاک نہ کرنے کی غلطی ایک ایسی غلطی ہے کہ جس میں معافی کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ اس کا سیدھا اور آسان ترجمہ یہ ہوسکتا ہے کہ اب یہ موٹر سائیکل ہماری نہیں رہی بلکہ کسی چور کی ملکیت بن چکی ہے کیونکہ ان دنوں موٹر سائیکلیں چوری کرنے کی وارداتیں زوروں پر تھیں اور ہر روز شہر سے دو چار موٹر سائیکلیں یوں اٹھالی جاتی تھیں کہ جیسے چیل مرغی کے بچوں کو اٹھا کر لے جاتی ہے۔ ان وارداتوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے علی بابا اور اس کے چالیس چور اس شہر میں گھس آئے ہیں اور اب یہاں پر چھاؤنی چھا کر ہی واپس جائیں گے۔۔۔۔ ہم نے دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ منت بھی مانی کہ اگر ہماری موٹر سائیکل چوری ہونے سے بچ گئی اور سالم حالت میں کھڑی مل گئی تو ہم نہ صرف یہ کہ دو نفل شکرانہ ادا کریں گے بلکہ صدقے کے طور پر ایک عدد کالے بکرے کی قربانی بھی دیں گے۔

اب ہم انعامی رقم کے کنوارے نوٹ وصول کرنے کے بعد پارکنگ لاٹ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ موٹر سائیکل صحیح وسالم اپنی جگہ پر موجود تھی اور اس کا کیل تک بھی چوری نہیں ہوا تھا یا تو کسی چور کی نظر نہیں پڑی تھی یا پھر اسے اس کو چرانے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔ ہم نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس نے ہماری لاج رکھ لی ورنہ ہم تو کہیں کے نہ رہتے اور اس سنگین لاپرواہی پر ہمارا کورٹ مارشل ہو جاتا۔ ہم نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب ہم صدر کے علاقے میں پہنچے تو ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ظہر کی نماز پڑھ لی جائے اور ساتھ ہی شکرانے کے نفل ادا کر کے اللہ میاں کا قرض چکا دیا جائے۔ یہی سوچ کر ہم نے موٹر سائیکل مسجد کے باہر کھڑی کی اور نفل ادا کرنے کے لئے مسجد میں گھس گئے۔ جب ہم عبادت سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو یہ دیکھ کر ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ موٹر سائیکل غائب تھی۔ کوئی کم بخت چور اسے چرانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

سنا ہے انگریزوں کے راج میں ایک شہر میں دو گھ گھگے کے جاگیر دار رہا کرتے تھے۔ ایک کا نام نصر اللہ خان تھا اور دوسرے کا فتح اللہ خان تھا۔ صاحب گورنر بہادر کے دربار میں اُن کی نشستیں اس طرح تھیں کہ پہلی نشست نواب نصر اللہ خان کی اور دوسری نواب فتح اللہ خان کی۔ نواب فتح اللہ خان نے نواب بہادر کی خدمت میں عریضہ پیش کیا کہ چونکہ یہ حقیر فقیر عمر اور مراتب شاہی اور ریاست اوت جاگیر کے اعتبار سے نواب نصر اللہ خان پر فوقیت رکھتا ہے لہذا کمترین کی نشست نواب نصر اللہ خان سے پہلے ہونی چاہئے۔ جب یہ بات نواب نصر اللہ خان نے سنی تو نواب صاحب نے گورنر بہادر کو یہ لکھ بھیجا کہ یہ خالص مذہبی معاملہ ہے اور تقدیم و تاخیر خود اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرما چکے ہیں، اور اس میں مداخلت کا حق کسی کو نہیں ہے۔ خود دیکھ لیجئے کہ ”نصر من اللہ فتح قریب“ میں پہلے کون ہے؟

ہم نے نقشہ ٹیبل پر بچھایا اور منصوبے پر گفت وشنید کرنے لگے۔

طے پایا گیا کہ آئندہ ہفتے کے روز کنگسٹن سے بسم اللہ کی جائے گی۔ ہیرس اور میں علی الصباح اُٹھیں گے اور ساحل سے کشتی لے کر چیرٹسی کی طرف نکل جائیں گے اور چونکہ جارج دوپہر تک کہیں آنے جانے کے قابل نہیں ہوگا (جارج بینک میں ہی اپنی نیند پوری کرلیا کرتا ہے، دس بجے جو لمبی تانتا ہے تو اُس دو بجے تک جاگنے کا نام نہیں لیتا، لگ بھگ دو بجے بینک کا وقت ختم ہوتا ہے تو بینک سے رخصت ہونے والا آخری ملازم یعنی چپڑاسی اُسے بیدار کر کے باہر کا رستہ دکھاتا ہے) اس لئے وہ ہمیں وہیں چیرٹسی میں آن ملے گا۔

کیا خیال ہے، دورانِ سفر خیمہ زنی کی جائے یا کسی سرائے کا رُخ کیا جائے؟

جارج اور میں کیمپنگ کے حق میں تھے، کیمپنگ کا تو مزا ہی اور ہوتا ہے، ہم کیمپنگ کی صورت میں ایک انتہائی آزاد اور رومان پرور زندگی کی رنگا رنگی دیکھ رہے تھے۔

بادلوں کے سرد اور ماندہ بطن سے دھیرے دھیرے سورج کی سنہری یادیں ماند پڑتی جاتی ہیں۔ خاموش پرندے کسی سسکیاں بھرتے بچے کی طرح گیت کا گلہ گھونٹ دیتا ہے، فضا میں مرغابیوں کے چیخیں بکھری ہوئی ہیں اور برساتی مینڈک کی سخت اور دلوں کو چھبنے والی آواز پانی میں سرسراتی ہوئی کنارے کی طرف لپکتی ہے جہاں دن اپنی آخری ہچکیاں لے رہا ہوتا ہے۔

گھرے سائے جورات کی آسیبی فوج کا حصہ ہیں، بے آواز قدموں سے رینگتی ہوئی دن کے کناروں جلوہ کناں اُجالوں کے باقی ماندہ محافظوں کے تعاقب میں رواں ہے۔ اُس کے غیر مرئی ،بے آواز، قدم بے ترتیب

سمندری گھاس کے سینے پر پڑ رہے ہیں اور رات نے زرد تاروں سے اخذ شدہ اپنے تاریک پروں کو خاموش وادیوں پر سمیٹ دیا ہے۔

ہم اپنی چھوٹی کشتی پر بیٹھ کر کسی ایسے گوشہ عافیت جا پہنچتے ہیں جہاں نہ کوئی بندہ نہ کوئی بندہ نواز ہو۔ خیمے گاڑ دئے جاتے ہیں اور تیل کے چولہے پر چھڑے چھانٹ کنواروں والا بدذائقہ کھانا یوں کھایا جاتا ہے جیسے من وسلویٰ حلق میں اتار رہے ہوں۔ پائپوں کے جہنم تمبا کو سے بھر کر جلا لئے جاتے ہیں۔ خوش گوار بات چیت ہلکے ہلکے سر بکھیرنے لگتی ہے۔ قریب دریا سے کوئی کشتی گزرتی ہے تو اس کے چپوؤں کی چپ چپ بھی اِس موسیقی میں تان ملانے لگتی ہے۔ ہماری باتوں کے دورانئے میں داستان گو دریا بھی پرانی اور پُر اسرار زمانوں کی روداد چھیڑے ہوتا ہے، ایسی روداد جو نامعلوم زمانوں سے سنائی جاتی رہی ہے اور نہ جانے کتنے زمانوں تک دوھرائی جاتی رہے گی، ہماری توجہ اس طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ ہماری دیکھا دیکھی چاند بھی اپنے چہرے سے بادل کا ٹکڑا ہٹاتا ہے اور رقص کرتی ہوئی لہروں پر اپنا بوسہ ثبت کر دیتا ہے، ہم سب اُسے اپنے تاجدار دریا کے سینے میں گاہے گنگناتے گاہے سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں، یہ نظارہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ہماری گفتگو کے سُر کمہلا نہ جائیں، ہمارے پائپ بجھ نہ جائیں، اور ہم میں موجود تلخ وشیریں افکار کے چشمے ماند نہ ہو جائیں اور رات کا خمار سے ہماری آنکھیں سرخ نہ پڑ جائیں اور ہم ستاروں بھرے آسمان کے نیچے نیند کے ہلکورے نہ لیتے نظر نہ آئیں۔ عین اسی لمحے جارج مجھے خیالات کے کوہِ قاف سے نکالتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہتا ہے۔۔۔۔ کیمپنگ کا شوق بجا لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر اس دوران بارش نے آلیا تو پھر کیا ہوگا؟؟

دودھ میں مینگنیاں ڈالنا جارج کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ظالم کو جمالیاتی حس تو چھو کر بھی نہیں گزری، جارج کے بارے میں کسی شاعر نے کبھی کوئی شعر نہیں کہا ہوگا۔ ضرورت سے زیادہ حقیقت پسندی نے اُس کے تمام نازک جذبوں کو سُن کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ ہمیشہ اشیاء کے اُس رخ کو دیکھتا ہے جسے کوئی بھی شخص دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ لبِ دریا بیٹھے ہوئے ہوں پانی کی لہریں ٹھہری ہُوئی ہوں، فضا میں ایک عجیب سرور آمیز کیفیت مسلط ہو۔ آپ مسحور ہو کر کہیں۔۔۔۔ کیوں بھئی جارج ! کیا تمھیں دریا کی ان پُر سکون لہروں کے نیچے دور کہیں سے جل پریوں کی آواز آتی ہوئی سنائی نہیں دیتی۔۔۔۔ یا پھر یہ کہ کیا یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی بھٹکی ہوئی اداس رُوح سسکیاں بھر رہی ہے۔ جواباً جارج پہلے تو بازو سے پکڑ کر بڑے غور سے آپ کی طرف دیکھے گا اور آپ کی بات دھرائے گا۔۔۔ بھٹکی ہوئی روح؟۔۔۔ پھر قدرے مسکرا کر کہے گا۔۔۔۔ ”کوئی پری وری نہیں ہے میاں! بات صرف اتنی سی ہے کہ تمھیں ٹھنڈ لگ گئی ہے، اسی لئے یوں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ اب اچھے بچوں کی طرح میرے ساتھ آؤ۔ یہیں قریب ہی ایک کافی ہاؤس موجود ہے ایک پیالی گرما گرم کافی حلق میں انڈیلو گے تو منٹوں میں دماغ ٹھکانے آجائے گا۔“

جارج کو ہمیشہ قریب ہی ایک ایسی دوکان کا پتہ ہوتا ہے جہاں آبِ مقطر ہمیشہ دستیاب رہتا ہے۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اتفاق سے آپ کا سامنا جنت میں بھی جارج سے ہو گیا (آپ کے گناہ وثواب آپ کے ذمے لیکن جارج کے اعمال کو دیکھتے ہوئے تو اس کے جنت میں جانے کے امکانات صفر فیصد سے بھی کم دکھائی پڑتے ہیں) تو وہ چھوٹتے ہی آپ سے کہے گا۔۔۔۔ ”شکر ہے تمھاری صورت تو نظر آئی۔ چلو میاں میرے ساتھ! میں نے یہیں قریب ہی ایک دودھ کی نہر دیکھ رکھی ہے۔ چل کر ایک ایک کپ دودھ کا پیتے ہیں۔“

جارج کی جمالیاتی حِس جیسی بھی ہو، تاہم متذکرہ معاملے میں تو اس کی بات میں وزن موجود تھا۔ واقعی اگر خیمہ زنی کے

دوران طوفانِ ابروباراں سے سابقہ پڑ گیا تو کیا ہوگا، بار شیلے موسم میں تو خیمہ زنی کچھ ایسا خوشگوار تجربہ نہیں ہوگا۔

شام کا سمے ہو، موسم پر لندن کا بڑھاپا غالب آیا ہوا ہو اور آپ بارش کے پانی سے شرابور ہوں، کشتی میں دو دو انچ پانی کھڑا ہوا ہو اور تمام اشیاء بھیگ چکی ہوں۔ ایسے میں کسی حسین سی جگہ کے انتخاب میں وقت ضائع کرنا اپنی شامت کو آواز دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ موسم کے ساتھ دریا کا رویہ کسی بھی لمحے بدل جانے کا گمان ہوتا ہے چنانچہ ہمیں خود ہی شرافت کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ، کشتی کو کنارے کی طرف دھکیلنے لگتے ہیں۔ کنارے پر پہنچ کر ہم خیموں کو کشتی سے گھسیٹ کر اتارتے ہیں اور کچھ دور جا کر نصب کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہ جگہ اُن جگہوں میں سے نہیں ہو جہاں پر ہم نے خیمہ زنی کی ٹھہرائی تھی۔

ایک تو ایسے بپھرے ہوئے موسم میں خیمہ نصب کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا، دوسرا خیمہ بھی جب بھیگ کر کسی غصیلی ساس کی صورت بے قابو ہُوا جا رہا ہو۔ کبھی ہاتھ سے پھسل کر سر پر آن گرتا ہو تو کبھی یوں رقص فرماتا ہو کہ موسیقی کے جدید پاپیوں کی اچھل کود یاد آ جائے۔ اِن تمام باتوں نے مجھے عجیب طرح کی جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رکھا ہوتا ہے۔ اِدھر موسم بھی مسلسل جلتی پر تیل چھڑ کے جا رہا ہوتا ہے۔ جارج خیمہ نصب کرنے میں میری مدد کر رہا ہوتا ہے لیکن مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہوتا ہے جیسے وہ مجھے الو بنا رہا ہو۔ جب کبھی میں بدقت خیمے کا اپنی طرف والا حصہ درست طور پر کھڑا کر دیتا ہوں تو وہ دوسری طرف سے جھٹکا دے کر تمام کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔

آخر مجھ سے رہا نہ جائے اور میں چلاتا ہوں ---- یہ بتاؤ تم آخر کر کیا رہے ہو؟

جواباً وہ بھی چلاتا ہے---کیا تمھیں خیمہ لگانا بھی نہیں آتا؟؟

ارے اُلو کی دم، تم اِسے اپنی طرف کیوں کھینچ لیتے ہو----

میں دوبارہ چلاتا ہوں----ہم خیمہ لگا رہے ہیں کوئی دستر خوان نہیں بچھا رہے ہیں، کیا تم سمجھ رہے ہو کہ ہم رسہ کشی کی مشق کر رہے ہیں ----!!

وہ جھنجھلا کر بوتا ہے----خیمے کو مسلسل گھسیٹے جا رہے ہو، آرام سے کیوں نہیں لگاتے----اِسے ذرا ڈھیلا چھوڑو!!

''میں کہتا ہوں تم بالکل غلط لگا رہے ہو'' میں دانت پیستے ہوئے دہاڑتا ہوں۔

دل میں ایک وحشیانہ سی خواہش چٹکیاں لے رہی ہوتی ہے کہ کاش جارج میرے سامنے ہو---گدی پر ایسا دو ہتھڑ جماؤں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا بچو جی کو----جھلا کر میں خیمے کو اپنی طرف کھینچتا ہوں جس سے تمام معاملہ گڑبڑا کر رہ جاتا ہے۔ جارج کی طرف والے کلے ایک جھٹکے سے اکھڑ پڑتے ہیں-----!

گاؤدی نہ ہو تو-----! جارج کی جھنجھلائی ہوئی بڑبڑاہٹ کسی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح کانوں میں پڑتی ہے---دماغ بھک سے اڑ جاتا ہے---لہو لاوے کی مانند کھولنے لگتا ہے۔ انتہائی طیش کے عالم میں ہتھوڑے کو زمین پر پٹختا ہوں اور جارج کی طرف لپکتا ہوں تاکہ اُس پر اس کی پیدائش کے بارے میں نت نئے انکشافات کر سکوں----جارج وہاں موجود نہیں ہوتا البتہ اس کی اشتعال انگیز بڑبڑاہٹیں صاف سنائی دے رہی ہوتی ہیں---غالباً وہ میرا انتظار نہ کر سکا تھا اور مجھے صلواتیں سنانے کی عجلت میں میری طرف روانہ ہو گیا تھا----گڑبڑ بس یہ ہوئی ہو کہ وہ خیمے کے دوسری طرف سے روانہ ہوا، چنانچہ میری طرح تشنہ کام رہا ہو۔ میں دوبارہ اُس کے پیچھے لپکتا ہوں اور وہ میرے پیچھے ------نتیجتاً ہم کافی دیر تک ایک دوسرے کے پیچھے چکر لگاتے رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو پکڑائی نہ دیتے ہیں۔ غالباً خیمے سے یہ سوکھی سوکھی آنکھ مچولی برداشت نہ ہو سکی تھی چنانچہ وہ بڑے اطمینان سے نیچے زمین پر لم لیٹ ہو جاتا ہے۔ اب درمیان میں کوئی سماج کی دیوار حائل نہ رہی تھی۔ میں اور جارج آمنے سامنے تھے۔ ہم دونوں نے بیک وقت خیمے کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر یک آواز ہو کر دہاڑتے ہیں----دیکھا میں نے کہا نہیں تھا؟؟

اسی اثناء میں ہمارا تیسرا ساتھی ہیرس جس کے ہاتھوں میں ہم نے کشتی کی زمام تھمائی تھی آن موجود ہوتا ہے۔ اس کی حالت ہم

دونوں سے زیادہ تقسیم اور غصہ بھی ہم دونوں سے سوا ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت اس کی موسم کے نام وہ صلواتیں ہوں جو وہ با آواز بلند دیے جا رہا ہوتا ہے۔

''تم دونوں کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' ----- وہ لال پیلا ہو کر بولتا ہے--- ابھی تک ایک خیمہ بھی نہیں لگا پائے!!

جارج اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر بیک وقت اُس پر پل پڑتے ہیں------ ہیرس غریب کو اِس قدر جارحانہ ردِعمل کی بالکل بھی توقع نہ تھی چنانچہ وہ ہم دونوں کو لیتا ہوا زمین پر گر پڑتا ہے۔ اُس کا منہ کیچڑ سے لت پت ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیچڑ سے مفر تو خیر ہمیں بھی نصیب نہیں۔ ہیرس کی جوابی کاروائی نے ہمیں بھی وہ خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا ہو جواب کیچڑ بن چکی تھی۔ ہم تینوں کافی دیر تک با ہم گتھم گتھا رہتے ہیں ادھر ہمارا یار غار مونٹو رینسی، ہمارا کتا بھی اس تماشے کو ورزشی سمجھتے ہوئے اسمیں شریک ہو جاتا ہے اور زور آزمائی کر بیٹھتا ہے۔ پھر جب ہماری طبیعتیں صاف ہو جاتی ہیں اور حواس بحال ہوتے ہیں تو تینوں بلکہ چاروں افریقی قبائل کے اُن باشندوں کی طرح دکھائی دے رہے ہوتے ہوں جو دورانِ جنگ جسم پر کیچڑ تھوپ لیا کرتے ہیں۔ جارج نے اپنے لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے چہرہ صاف کر تے ہوئے کہتا ہے---- ''دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ کیمپنگ ٹھیک نہیں'' ----!!!

آخر کسی نہ کسی صورت خیمے نصب کرنے کا مرحلہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس بار خیموں نے کوئی نخرہ بازی نہ کی۔ اب چیزوں کو ترتیب سے رکھنے کا سوال اُٹھتا ہے۔ تمام اشیاء بری طرح بھیگی ہوئی ہوتی ہیں۔ انہیں کیسے پونچھا جائے---- گیلے تولیوں سے؟؟

بہر حال جو چیز جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے، کے مصداق سب چیزیں سلیقے سے رکھ دی جاتی ہیں۔ دریا کے کنارے جا کر غسل فرمانے اور پھر گیلے کپڑے زیب تن کر چکنے کے بعد قدرے قرار نصیب ہوتا ہے۔ کمبل اگر چہ گیلے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی آخر کمبل ہی ہوتے ہیں، کچھ نہ کچھ کام دے ہی جاتے ہیں۔ جنگل کی لکڑیوں سے آگ جلانا تو خیر ناممکن ہوتا ہے۔ بھلا گیلی لکڑیاں آگ کو کیا

لفٹ کرائیں، مجبوراً تیل کے چولہے پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ چولہا جلا کر رات کا کھانا تیار کیا جائے۔ رات کے کھانے میں بارش کا پانی ہماری غذا کا جزولاینفک ٹھہرا جاتا ہے۔ کھانے کی ہر چیز تر بتر ہوتی ہے۔ ڈبل روٹی کا تین چوتھائی حصہ اس کی دریا دلی کا اسیر ہوتا ہے۔ اسی طرح مکھن میں بھی بارش کا پانی اِس کثرت سے موجود ہوتا ہے کہ لگتا ہے جیسے اس کے اندر ڈوب کر سراغ زندگی پانے کا متمنی ہو۔ جام، پنیر، نمک، کافی غرض سب کا اس نے اچار مربہ بنا کے رکھ دیا ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں کھائیں تو نئی نویلی دلہن کے ہاتھوں پکائے ہوئے کھانے کا لطف مل جائے۔

کھانے کے بعد حسبِ معمول تمبا کو کی طلب دامن گیر ہوتی ہے۔ تمبا کو کا ڈبہ کھول کر دیکھا جاتا ہے تو سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے، سارا تمبا کو گیلا ہو چکا ہوتا ہے۔ میں تو مایوس ہو کر سر ہی ڈال دیتا ہوں لیکن ہیرس گیلے تمبا کو کو ہی پائپ میں بھر کر سلگانے لگتا ہے۔ بھلا ہتھیلی پر بھی سرسوں جمی ہے کبھی---- غریب اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے۔ اتنے میں جارج جو بڑی سرگرمی سے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے، چلاتا ہے---- وہ مارا!! ہم دیکھتے ہیں تو اُس کے ہاتھوں میں شیمپن کی بوتل ہوتی ہے۔ ہم دونوں کے چہرے بھی کھل اٹھتے ہیں---- ایک ایک جام چڑھاتے ہیں تو زندگی میں اتنی دلچسپی نظر آنے لگتی ہے کہ بستر پر دراز ہوا جائے اور خوشی خوشی ''شب بخیر'' کہہ کر لمبی تان لی جائے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خود پر بیتے ہوئے حالات کا عکس خوابوں میں بھی جھلکنے لگتا ہے۔ اگر آپ کو عالم بیداری میں کسی پریشانی نے مرغا بنائے رکھا ہے تو خواب میں بھی آپ اپنے آپ کو کان پکڑے ہوئے دیکھیں گے۔ یہی کچھ میرے ساتھ اُس رات خیمے میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ خواب میں دیکھوں کہ یکلخت ایک ہاتھی میرے سینے پر آ کر سوار ہو جاتا ہے اس کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکہ ہوتا ہے۔ کوئی آتش فشاں پھٹا ہوا ہوتا ہے جس نے مجھے اٹھا کر سمندر کی گہرائیوں میں پھینک دیا ہوتا ہے---- ہاتھی بدستور میرے سینے پر استراحت فرما رہا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیا بات ہوئی اگر

کوئی ہاتھی میرے سینے پر بیٹھا ہوا تھا تو آتش فشاں مجھے سمندر میں کیسے پھینک سکتا ہے۔اور اگر ایسا ہو بھی گیا ہو تو ہاتھی بدستور میرے سینے پر کیسے بیٹھا رہ سکتا ہے۔یعنی اگر یہ ہے تو وہ کیسے ہے، اگر وہ ہے تو پھر یہ کیسے ہے۔اِسی الجھن میں میری آنکھ کھل جاتی ہے۔مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ آتش فشاں اور ہاتھی کے مسئلے کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ اور مسائل بھی وقوع پذیر ہوگئے ہیں۔۔۔۔۔اول اول تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قیامت آچکی ہے،صور پھونکا جاچکا ہے اب آسمان زمین پر آن گرا ہے ۔۔۔لیکن اِس کے ساتھ ہی میں خود ہی اپنے خدشے کی تردید کردیتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا غالباً ڈاکوؤں نے حملہ کردیا ہے یا پھر کوئی آگ وغیرہ لگ گئی ہے۔۔۔۔ظاہر ہے یہی کچھ ہوسکتا تھا۔قیامت بھلا کیسے آسکتی ہے۔ابھی تو میں نے اتوار کے اتوار چرچ جانا موقوف نہیں کیا۔۔۔مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے ہزاروں لوگوں کے مجمع نے مجھ پر چڑھائی کردی ہو اور اب ان کے درمیان میرا دم گھٹا جارہا ہو۔۔۔کوئی ایسا اللہ کا بندہ نہیں ہے جو میری نجات کو آئے اور مجھے ان کے شکنجے سے رہائی دلائے۔

گمان ہوتا ہے کہ جیسے وہیں کہیں آس پاس کوئی اور ذی روح بھی موجود ہو جو میری طرح کسی انجانی مصیبت میں مبتلا ہے۔اُس کی خوف میں ڈوبی ہوئی آوازیں خود میری چارپائی کے نیچے سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔۔۔اِس تاثر کے ساتھ ساتھ میرے اندر یہ خوف بھی پھنکارنے لگتا ہے کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔۔۔کوئی جناتی عفریت میرے جسم کو نگھلتا جارہا ہے۔اپنی قیمتی زندگی کو بچانے کیلئے میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کردیتا ہوں، ساتھ ہی چیخوں اور فریادوں کا تڑکا بھی لگائے جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔مجھے اپنی ریاضت رنگ لاتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔۔۔چند ہی لمحوں میں میں اپنے آپ کو گردن تک کھلی فضا میں پاتا ہوں۔مجھ سے تقریباً دو فٹ کے فاصلے پر کوئی کفن بردوش آسیب نظر آتا ہے۔۔۔۔"اچھا تو یہی وہ عفریت ہے جو میری زندگی کے درپے ہے۔" میں سوچتا ہوں اور پھر اپنی زندگی اور موت کی جدوجہد کیلئے سینہ سپر ہو جاتا ہوں۔ٹھیک اسی وقت میرے شعور میں اُس عفریت کی شناخت ابھرتی ہے۔وہ جارج ہے۔۔۔عین اسی وقت جارج بھی مجھے پہچان لیتا ہے اور منہ کھول کر چلاتا ہے "ارے! یہ تو تم ہو!! تمھیں ہوناں جے ؟"

ہاں! ہوں تو میں ہی!۔۔۔میں آنکھیں ملتا ہوا کہتا ہوں ۔۔۔لیکن ہوا کیا تھا ؟؟

ہونا کیا ہے۔۔۔کمبخت خیمہ اکھڑ گیا ہے ۔۔۔وہ سر کھجا کر کہتا ہے۔

ہیرس کہاں ہے؟؟ اب ہم دونوں کو ہیرس کی فکر پڑ جاتی ہے۔جارج اپنی دونوں ہتھیلیوں کو بھونپو بنا کر پکارنے لگتا ہے۔۔۔"ہیرس! ہیرس!"

عین اِسی لمحے اتفاقاً میری نظر جارج کے عقب میں پڑتی ہے ۔۔۔وہاں زمین پر پڑے ہوئے خیمے کے نیچے کوئی چیز ہاتھ پاؤں مار رہی ہوتی ہے، اس کیساتھ ہی ایک گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دیتی ہے۔۔۔۔"ارے کیا تم لوگ اندھے ہو؟؟ میں یہاں ہوں۔۔۔خیمے کے نیچے !!"

اِس سے پہلے کہ ہم اِس کی مدد کریں، وہ خود ہی خیمے کے نیچے سے نکل آتا ہے۔یہ ہیرس کی انتہائی بگڑی ہوئی شکل ہوتی ہے، یوں لگتا ہے جیسے ہنری ہشتم کو کسی فریادی نے چھیڑ دیا ہو۔

"یہ کس نامعقول کی حرکت تھی؟"۔۔۔۔وہ دہاڑتے ہوئے بولتا ہے۔

اگر یہ کسی کی حرکت ہوتی تو وہ شخص یقیناً نامعقول ہوتا، لیکن میرے خیال میں یہ ساری کارستانی خود خیمے کی پیدا کردہ رہی ہوگی جسے انتہائی غلط وقت پر قیلولے کی سوجھی۔ بہرحال ہیرس کو قائل کرنا ہمیشہ سے بہت مشکل کام رہا ہے۔وہ بدستور بضد رہے کہ یہ اُس کے خلاف کسی بدطینت کی باقاعدہ منصوبہ بندی تھی، بلکہ وہ تو کبھی کبھار ہماری طرف بھی شک بھری نظروں سے دیکھ لیا کرتا تھا ۔۔۔اُدھر جارج کی یہ رُوں رُوں بھی مسلسل جاری رہتی ہے کہ "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ کیمپنگ ٹھیک نہیں!!"

چنانچہ ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اگر موسم اچھا ہوا تو ہماری راتیں تاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں کٹیں گی لیکن اگر کبھی

موسم کا مزاج برہم ہو یا ایسا ہونے کا کچھ احتمال ہوا تو ہم اپنی راتیں شریف آدمیوں کی طرح کسی ہوٹل یا سرائے میں بسر کریں گے کہ اِسی میں ہماری نجات ہے۔

مونٹمورینسی نے اپنا ووٹ پُرزور طریقے سے دم ہلا کر کاسٹ کیا۔ وہ رومانویت کا تو کسی بھی صورت متحمل نہیں ہوتا تھا۔ اُسے پُرشور فضا سے ہمیشہ سے اُنس رہا ہے۔ ایسے موقع پر وہ مچل مچل اُٹھتا ہے۔ اُس کی طرف دیکھا جائے تو لگے گا کہ اللہ میاں نے کسی معصوم فرشتے کو اضافی خوصیات کی بناء پر فاکس ٹیرر کی صورت میں کرۂ ارض پر بھیجا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس بدوضع اور غیر متوازن دنیا کو کسی مثالی خطے میں بدلنا چاہتا ہو۔

پہلے پہل جب وہ میرے خرچ پر میرے ہاں رہنے کے لئے لایا گیا تھا تو میرا خیال تھا کہ میں اُسے زیادہ دیر برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ جب میں کسی کرسی پر بیٹھ کر اُس کے نحیف و نزار جثّے کی طرف دیکھا کرتا تھا اور وہ بھی جواباً بیٹھک کے غالیچے پر بیٹھ کر اور تھوتھنی اُٹھا کر بڑی معصومیت سے مجھے دیکھا کرتا تھا تو میں سوچا کرتا تھا کہ یہ زیادہ دیر جی نہیں پائے گا۔ موت کا فرشتہ اسے دور آسمانوں میں کھینچ کر لے جائے گا۔۔۔۔ یہی کچھ ہونا اُس کا مقدر دکھتا تھا، لیکن جب پھر یوں ہوا کہ جب مجھے اُن درجنوں مرغیوں کی قیمت ادا کرنی پڑی جو اس کی خونخواری کا شکار ہوئے تھے یا جب میں لگ بھگ ایک سو بیس ''سٹریٹ فائٹس'' سے اُسے اُس کے گلے میں پڑے ہوئے پٹے سے کھینچتا ہوا گھر لایا یا پھر جب میرے ملاحظے کے لئے ایک مردہ بلی لائی گئی جو اُس کی غصے سے پاگل ہوتی ہوئی مالکن لے کر آئی تھی اور بآوازِ بلند مجھے قاتل قرار دے رہی تھی، تو مجھے اُس کی جنگجو طبیعت کا ادراک ہوا اور میں نے سوچا کہ اسے اپنی دنیا میں کچھ صدیاں مزید گزارنے کی اجازت دے دیتا ہوں۔

اصطبل کی حفاظت کرتے ہوئے کئی خونخوار بھیڑئے نما کتوں کو ایک عظیم الشان لڑائی کے بعد بھاگنے پر مجبور کرنے کا نام زندگی ہے۔ کم از کم مونٹمورینسی کا تو زندگی کے بارے میں یہی نظریہ ہے۔ اصطبل نہ سہی، ہوٹل یا سرائے ہی سہی، شائد مونٹمورینسی کے صاد کرنے میں یہ بھی ایک نقطہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی جگہ کی حفاظت کا ذمہ لینا اپنی جبلتی ذمہ داری سمجھتا تھا۔

جب آؤٹنگ کے دوران سونے کا مسئلہ متفقہ طور پر طے ہو گیا تو اب ہمارے بحث کرنے کے لئے یہی موضوع رہ گیا تھا کہ اس مہم میں کون کون سا سامان ساتھ لے جایا جائے۔ میں نے ابھی اس باب میں کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ہیرس بولا ''بھئی! اب بس بھی کرو، میں نے اپنی اب تک کی بات چیت کا کوٹا پورا کر لیا ہے، اب ایسا کرتے ہیں کہ نارمل انسانوں کی طرح باہر نکلتے ہیں اور کچھ کہیں چل کر کافی شافی پی لیتے ہیں۔ مجھے ساتھ والی گلی کے نکڑ میں ایک ایسی دکان پر پتہ ہے جہاں ہم موج میلہ کر سکتے ہیں۔

جارج بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ اُسے بھی پیاس لگی ہوئی ہے (مجھے تو کوئی ایسا وقت یاد نہیں جب اُسے پیاس نہ لگی ہوئی ہو) اور یہ کہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کافی یا وِسکی سے اُس کی ازلی پیاس بجھ جائے گی۔ تھوڑے کہے کو بہت سمجھ کر ہم سب نے باقی معاملات کل پر چھوڑے اور اسمبلی برخاست کرتے ہوئے اپنے اپنے ہیٹ سروں پر جمائے اور گھر سے باہر نکل پڑے۔

تیسرا باب انشاءاللہ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اگلے شمارے میں

اقبال شانہ

جو ہم گرے کبھی یارو تو بیخودی میں گرے
یہ آپ اتنی بلندی سے کس خوشی میں گرے

وہ اور لوگ ہیں اٹکے ہیں جو کھجوروں میں
ہم آسمان سے ٹپکے تری گلی میں گرے

یہ اور بات سے ٹوٹی ہیں پسلیاں لیکن
ہمیں ہے ناز ہم تیری عاشقی میں گرے

ہمارے شعر جو بھیجے گئے رسالے کو
نہ جانے کیسے وہ ردی کی ٹوکری میں گرے

کھڑے ہیں آج الیکشن میں پھر وہی لیڈر
بُری طرح جو کئی بار لیڈری میں گرے

گرا ہوں میں تو اندھیروں میں ٹھوکریں کھا کر
مگر جناب تو سورج کی روشنی میں گرے

نہا رہے تھے وہ حمام میں مزے لے کر
نجانے کس لئے گھبرا کے بالٹی میں گرے

ہرا سکا نہ ہمیں کوئی پہلوانی میں
گرے اگر کبھی شانہ تو شاعری میں گرے

اقبال شانہ

روزِ ماتم جشن منانا ٹھیک نہیں
شادی کے دن بینڈ بجانا ٹھیک نہیں

لوگ بڑی دلچسپ ڈکاریں لیتے ہیں
یارو اِتنا زیادہ کھانا ٹھیک نہیں

لیٹ ہمیشہ ریل کی مانند ہوتی ہو
جانِ جاناں دیر سے آنا ٹھیک نہیں

کیسا ہو جب شعر حلق میں پھنس جائے
ٹائی لگا کر شعر سنانا ٹھیک نہیں

یار پہلوانوں کی گلی میں رہتا ہے
یار کے گھر میں آنا جانا ٹھیک نہیں

میں اپنے سائے سے ڈرتا ہوں بیگم
خوفزدہ انساں کا ڈرانا ٹھیک نہیں

کیسے پہچانوں میں تجھ کو جانِ جاں
اتنا میک اپ تھوپ کے آنا ٹھیک نہیں

جاؤ کوئی اچھی ڈش کھاؤ یارو
چھٹی کے دن بھیجا کھانا ٹھیک نہیں

شانہ محبوبہ کو شعر سناتے ہو
بھینس کے آگے بین بجانا ٹھیک نہیں

عرفان قادر

پکڑ کے اک ڈکیت کو کمال کر دیا گیا
پھر اُس کو چھتروں سے لال لال کر دیا گیا

خزانہ خالی کر دیا چلا کے میٹرو بسیں
بڑھا کے ٹیکس عوام کو نڈھال کر دیا گیا

میں جب تلک کنوارہ تھا، سکون ہی سکون تھا
بیاہ کر، مرا سکوں محال کر دیا گیا

ہے گھی ختم، نمک ختم، پیاز مرچ بھی نہیں
تمھیں یہ انڈا اِس لیے اُبال کر دیا گیا

جب اُٹھ نہیں رہا تھا رانجھا ہیر کی گلی سے کل
تو فوراً ایک گلّو بٹ کو کال کر دیا گیا

کباب، کوفتے اُنھیں کھلائے جا رہے تھے تب
ہمارے آگے چاولوں کا تھال کر دیا گیا

ملے گا عدل کس طرح وہاں کسی غریب کو
جہاں پہ عدلیہ کو مالا مال کر دیا گیا

قصائی نے بتا کے دام، ہوش ہی اُڑا دیے
ہمیں بھی ساتھ بکرے کے حلال کر دیا گیا

عجب غضب کے فیشنوں کا دور آ گیا ہے یہ
کہ آج کل دوپٹے کو رومال کر دیا گیا

بنا دیے گئے فلائی اوور ایک شہر میں
بقایا مُلک چاڈ، سینیگال کر دیا گیا

عرفان قادر

آئے قزاق، گئے نوٹوں کا تھیلا لے کر
اُن کو ڈھونڈے گی "پولس"، تم سے ہی پیسا لے کر

اُس کو سمجھا کے میں آیا تھا ترے گھر کا پتا
دو مِنَٹ میں ابھی پہنچے گا وہ پیزا لے کر

ٹنڈ کو بس گھور کے دیکھا تھا، کہا کچھ بھی نہ تھا
میرے پیچھے چلا آیا ہے وہ ڈنڈا لے کر

ایک کیسٹ ہی چلا دیجیے، "با با با" کی
خرچہ مت کیجیے قربانی کا بکرا لے کر

کوئی جُھمکا نہیں، بالی نہیں، چوڑی بھی نہیں
وہ ہے "مُلوَنڈی"، وہاں جائیے حلوا لے کر

اِس میں نہ عشق ہے، نہ حُسن ہے، نہ آہ و بکا
تم یہاں آئے ہو کیوں؟، شاعری "گھٹیا" لے کر

آج سے پھر شروع ہونے کو ہے اک جنگِ عظیم
آج ہی آیا ہے، بیگم مری، سالا، لے کر

ہم سمجھتے تھے، وہ سنگل ہے، نہیں شادی شُدہ
کل وہ پھرتی تھی، میاں ساتھ تھا، بیٹا لے کر

کیوں مجھے ڈانٹتے ہیں، روز ہی، امّاں ابا
میں جو اسکول سے آجاتا ہوں، انڈہ لے کر

ہائے میں شومئیِ قسمت کا کروں کیا شکوہ
دانت اک باقی تھا وہ بھی گیا چوہا لے کر

شوکت جمال

سیاستداں بچارے کی پریشانی نہیں جاتی
خریدی اُس نے جو ڈگری کہیں مانی نہیں جاتی

لڑکپن ہی سے غالبؔ کی طبیعت عاشقانہ تھی
گی ہولت جو بچپن سے بآسانی نہیں جاتی

مری داد کی نانا سے ہوئی جس روز سے ان بن
اِدھر آتی نہیں دادی ، اُدھر نانی نہیں جاتی

قلم تختی سیاہی طاقِ نسیاں کی ہیں اب زینت
مگر یادوں سے جو مٹی تھی ملتانی نہیں جاتی

بھٹکتی ہیں نگاہیں شیخ جی کی "Mall" میں لیکن
کسی بھی حال میں بیگم کی نگرانی نہیں جاتی

جھپٹ کر کھال وہ بولا ، ثواب اس کا ہی پاؤ گے
وہاں کھالیں ہی جاتی ہیں یہ قربانی نہیں جاتی

لگاتا ہے کئی چکر ڈرائنگ روم کے شوکتؔ
پڑھا کر جب تلک بچوں کی اُستانی نہیں جاتی

شوکت جمال

پہلو میں وہ رقیب کے بیٹھے ہوئے ہیں آج
لگتا ہے اُن کو اور نہیں کوئی کام کاج

ہوتا ہوں مستفیض میں سب کے کلام سے
غالبؔ ہوں یا نظیرؔ ہوں یا میرؔ یا سراجؔ

توڑے ہیں اس نے وصل کے وعدے جو بیشمار
کر کر کے تھک گیا ہوں رجسٹر میں اندراج

فرصت بھلا ہے چھان پھٹک کی کسے یہاں
اِس واسطے نہیں ہیں تصرف میں چھاج واج

میری طرف سے آپ کو بس وہم ہے جناب
لقمان کے مطب میں بھی اِس کا نہیں علاج

اظہارِ شوق کے لئے کب سے ہوں منتظر
لیکن کبھی حضور کا ملتا نہیں مزاج

شوکتؔ کی زندگی تو ہے جیسے کھلی کتاب
رکھتا ہے پر چھپا کے وہ تعدادِ ازدواج

سید مظہر عباس رضوی

پہلے کوچے میں ترے والدِ خونخوار پڑے
بعد میں کتے گلی کے بھی ہمیں چار پڑے

اُس کی زلفوں کی اسیری نے یہ دن دکھلائے
ہوگئے جیل میں چھ سال گرفتار پڑے

ڈاکٹر چل دیا آرام سے اُس نرس کے ساتھ
رہ گئے ہم وہیں بیمار کے بیمار پڑے

زلف لہراتی ہوئی اچھی تو لگتی ہے مگر
روٹی سالن میں نہ ہوں گیسوئے خمدار پڑے

وہ بھی چھ بچوں کی ماں بن گئی اس مدت میں
''منجھیاں'' توڑ دیں چھ ہم نے بھی بیکار پڑے

مار کھا کھا کے تو ہم نے یہی سیکھا ہے سبق
بیچ جھگڑے میں کسی کے نہ سمجھدار پڑے

کش لگا کر کہا سگریٹ کا یہ ابا جی نے
اچھی عادت نہیں ، اس میں جو خبردار پڑے

ڈگریاں جعلی، دوا نقلی، غذا دونمبر
بچ کے جائیں گے کہاں آپ جو بیمار پڑے

لطفِ نظارہ تھا فیشن کی بدولت مظہر
آدھی تنخواہ میں وہ عارض و رخسار پڑے

سید مظہر عباس رضوی

سخن طرازی کی فیکٹری میں یہ لفظ بھی ہیں بلا کے پُرزے
زبانِ انجینئر میں ہوتے ہیں اب غزل خواں لگا کے پُرزے
جو قافیہ ایک ہم نے جوڑا، ردیف فوراً قلم سے پھسلا
سخن کے net، bolt آج tight کئے ہیں ہم نے جما کے پُرزے
ہمارے شاعرِ سخن کی محفل میں پیچ کس لے کے آ گئے ہیں
گرا اگر وزنِ شعر تو وہ اُٹھائیں گے اب لگا کے پُرزے
گھما رہے ہیں مشین کی کل، نہ ٹھیک ہو تو رہیں وہ بیکل
بنے ہیں خود وہ مشین لیکن بہت ہی خوش ہیں بنا کے پُرزے
جو کام کرنا تو تخلئے میں، نہ جان کھو جوئے حادثے میں
جو آئے بیگم کو سخت غصہ نہ مار دے وہ گھما کے پُرزے
کہیں broca کہیں wernicke دماغ لفظوں کو یوں کرے pick
جو آئے شہرِ سخن میں دیکھے ، ہوئے ہیں کیسے صدا کے پُرزے
brain میں جو مشین fit ہے، اِسی سبب دی خدا نے wit ہے
عطائے خالق ہیں لفظ سارے، یہی ہیں نطقِ رسا کے پُرزے
اگرچہ محبوبہ اور بیوی کی ساخت میں فرق کچھ نہیں ہے
ہے ایک candy تو ایک مرچی، عجیب ہیں یہ خدا کے پُرزے
پریشاں درزی ہے کیا کرے وہ، ملا ہے اُس کو fitting کا order
وہ سی رہا ہے لباس لیکن اُڑا رہا ہے قبا کے پُرزے
نصیب اونچا ہو، کیا سبب ہو، بلند اقبال کیسے اب ہو
ہمارے بچے اُڑا رہے ہیں وہ دیکھو ''بانگِ درا'' کے پُرزے
نہ کوئی ورزش نہ کوئی اسپیچ تھیراپی اب بتا رہا ہے
دوائیں لکھ لکھ کے ڈاکٹر سب اُڑا رہے ہیں شفا کے پُرزے
جو بیٹھنا چاہا بزمِ جاناں میں ہم نے مظہر تو پھر ہوا یوں
اشارہ اُس نے کیا کہ ''جا! جا!!'' جفا سے ''ف'' کے اُڑا کے پُرزے

سید تنویر الدین احمد پھولؔ

ہم دل میں آس لے کے گئے شیر مال کی
گھر پر بلایا اُس نے تو دعوت تھی دال کی
صورت نظر تو آئی ہے اب اندومال کی
اُس نے ہمارے واسطے مرغی حلال کی
شامل رہی ہے وہ بھی کیا اصحابِ کہف میں
وہ تیس سال سے ہے فقط بیس سال کی
مہنگائی کا سروں پہ ہے یوں اُسترا چلا
اِس ابتلا نے سب کی طبیعت نڈھال کی
لیڈر ہمارا خوب ہے، چکنا گھڑا ہے وہ
پرواہ نہیں کچھ بھی اُسے قیل و قال کی
کہتا ہے اُس کا مفت میں گنجی ہوئی ہے قوم
اِس میں نہیں ہے بات ذرا بھی ملال کی
مٹھی نہ اُن کی گرم ہوئی، وہ غضب میں ہیں
اُن کو ہوس شدید ہے مال و منال کی
چمکی جو اُن کی چاند تو خیرہ نظر ہوئی
اب بات کیا بتاؤں میں اُن کے جمال کی
گانا سنا جو اُن کا تو بچے دہل گئے
آواز جیسے رات میں آئے شغال کی
تعبیر اس کی یوسفِ دوراں بتائیں گے
دیکھی تھی ہم نے خواب میں گلرو کی پالکی
خوش ہو کہ اب تو بن گیا اُس کے گلے کا ہار
گلشن میں تجھ کو پھولؔ تو حاجت تھی ڈال کی

سید تنویر الدین احمد پھولؔ

برق کی بیحد کمی ہے کیا کہوں
موم بتی جل رہی ہے کیا کہوں
کیا کہا! وہ قوم کا ہمدرد ہے؟؟
اپنا لیڈر لالچی ہے کیا کہوں
کہہ رہے تھے کل جو خود کو خر نواز
لات اُس کی بھی پڑی ہے کیا کہوں
گوشت کھانا ہو تو بن جنگل کا شیر
دال بھی مہنگی ہوئی ہے کیا کہوں
ہے یہ افریقہ میں لیکن دوستو!
مصر مصری کی ڈلی ہے کیا کہوں
ایک ذرہ یاں نظر آتا نہیں
چین میں چینی ملی ہے کیا کہوں
شہر کی کیسے صفائی وہ کریں
مچھروں سے دوستی ہے کیا کہوں
اُن کو گلیوں سے مہک آتی نہیں
ناک اونچی ہو گئی ہے کیا کہوں
کوئی بھی لیڈر نہیں پرسانِ حال
قوم کی حالت بُری ہے کیا کہوں
ٹکڑے ٹکڑے ہے سیاسی اتحاد
دال جوتوں میں بٹی ہے کیا کہوں
اُسترا مہنگائی کا سر پر چلا
قوم گنجی ہو گئی ہے کیا کہوں
کر گیا چٹ یار ہے مرغی کی ران
صرف ہڈی ہی بچی ہے کیا کہوں
شائد آ جائے اب اس میں کچھ اُبال
پھولؔ کی باسی کڑھی ہے کیا کہوں

خاورؔ

منظور ہے سب کچھ مجھے دلہا نہیں بنتا
ہاں مجھ کو تیرے منے کا ابا نہیں بنتا

میں جیسا ہوں، ایسا ہی اسی حال میں خوش ہوں
مجھ کو کسی عورت کا کھلونا نہیں بنتا

میں شادی کے جھنجٹ پہ کبھی غور تو کرلوں
مجھ کو وِلے مظلوم سراپا نہیں بنتا

ہر فیشنی عورت سے خدا دور ہی رکھے
مجھ کو کسی سرکس کا تماشا نہیں بنتا

سو بار بھی پوچھو گی تو ہر بار کہوں گا
ڈیڈی نہیں بنتا مجھے پاپا نہیں بنتا

کیوں آپ کے سر میں نہیں یہ بات سماتی
ایسا نہیں بنتا مجھے ویسا نہیں بنتا

پاگل ہیں جو کہتے ہیں کہ کر لیجیے شادی
سن لیجیے سب کہ مجھے مرغا نہیں بنتا

ہر بات پہ کہتا ہے جو بیوی کی، بجا ہے
بجتا ہی جو رہتا ہے وہ باجا نہیں بنتا

شادی کا ہو جنجال تو پھر بال کہاں کے
تم معاف رہی رکھو مجھے گنجا نہیں بنتا

خاورؔ

مجھ پہ دولت وار دے مولا
مجھ کو کوٹھی کار دے مولا

نوکری شوکری کیا کرنی ہے
وڈا کاروبار دے مولا

تھوڑے پیسے کیا کرنے ہیں
تُو جب دے بسیار دے مولا

ریما، میرا، ریشم، خوشبو
نرگس یا دیدار دے مولا

ایک تو خالی جیبیں بھر دے
اک سوہنا دلدار دے مولا

اُس کے میرے بیچ آتا ہے
اُس کا ابا مار دے مولا

ارزم اظہر

کیا بُرا زن مرید ہوتا ہے؟
قابلِ رشک و دید ہوتا ہے

پیر جورو کے چومنے والا
اب مثالِ فقید ہوتا ہے

ایک بیگم پہ کیا قناعت ہو
بس کہ ھل مِن مزید ہوتا ہے

گھر جمائی تلاش کرتے ہیں
کیا یہ وصفِ حمید ہوتا ہے

عقد ثانی بھی ہو گا اوّلی کر
کیوں تو خاطر کبید ہوتا ہے

سب پہ اظہر کرم پری رُخ کا
تجھ پہ غصہ شدید ہوتا ہے

ارزم اظہر

فائدہ کیا ہے ایسی سی سی کا
ہو دگر ذائقہ جو مرچی کا

شوہریت بھی لے کے کیا کرنا
سگ ہی بہتر ہے اس سے دھوبی کا

پارلر تک بگاڑ کچھ نہ سکے
کیا کیا جائے ایسی بیوی کا

اوراسکول میں تھا کیا رکھا
پیریڈ ایک ہی تھا پی ٹی کا

باپ گھر سے نکالنا تھا کہا
کھانستا ہے مریض ٹی بی کا

اک حسینہ کو پھول دینا ہے
پر یہ موسم نہیں ہے گوبھی کا

جانتا کون تھا، ہے زرداری
فائدہ ہو گیا ہے بی بی کا

آہ بھر کے وہ بول دی بڈھیا
اب کسے انتظار سیٹی کا

توڑ دوں دانت میں ترے اظہر
شوق کتنا ہے تجھ کو کھی کھی کا

سید ظفؔر کاظمی

نہ رُستا ہے نہ پاس آتا ہے کوئی
بس اُدھ وچکار چھڈ جاتا ہے کوئی

جہانِ درد میں کیوں روشنی ہے
سر کو کیا ادھر لاتا ہے کوئی

اکیلے میں تو چلتا ہے اکڑ کر
مگر تکتے ہی لنگڑاتا ہے کوئی

نہیں پیتا تھا پہلے پانی ہم سے
ہمیں سے کھیر اب کھاتا ہے کوئی

ظفؔر فیصل کی اپنی اک ادا ہے
کہاں اس تک پہنچ پاتا ہے کوئی

سید ظفؔر کاظمی

حضرتِ غوث خواہ مخواہ سے معذرت کے ساتھ

سال بھر پکتے ہیں گھر میں ساگ پات
اب کہاں وہ مٹھیاتن ، بیفیات

عید پر قربان ہم پر ہو گئے
اونٹیاتن ، بچھڑیاتن ، بکریات

گم ہیں سارے کرکٹ و اخبار میں
افسراتن ، بیویاتن ، دختراتت

زندگی بھر خواب میں تکتے رہے
کوٹھیاتن ، بنگلیاتن ، لانیات

کھا گئے پٹواری جی سب بیچ کر
قبضیاتن ، مالکاتن ، شاملات

پیر جی کچھ مانگتے ہیں نقش پر
مرغیاتن ، مغزیاتن ، نوٹیات

نوید ظفر کیانی

سوالِ وصل پہ اصرار اِتنا بھی کیا ہے
کہ تنگ آ کے کوئی پوچھنے لگی۔۔۔کیا ہے

نہیں ہیں نوٹ تو بٹوہ ہے ایک بارِ گراں
دماغ جس میں نہیں ہے وہ کھوپڑی کیا ہے

وہی ہے بکرے کی میں میں تمہاری باتوں میں
تمہیں خبر نہیں دستورِ دوستی کیا ہے

عوام کیوں ہے خیالی جگالیوں میں مگن
جو لیڈروں نے دکھائی ہری ہری کیا ہے

تُو گھر میں کس لئے لیتا ہے آ کے خراٹے
یہ خانگی ہے تو پھر کارِ دفتری کیا ہے

جو پارلر میں گئی تھی وہ بوڑھی بی ہے کہاں
جو پارلر سے نکلتی ہے وہ پری کیا ہے

یوں توڑتا نہ دھڑلے سے دست و پائے سخن
اگر میں جانتا ہوتا کہ شاعری کیا ہے

تمہاری منج تو کھولی نہیں ہے میں نے ظفر
سنا رہا ہے مجھے کیوں کھری کھری' کیا ہے

نوید ظفر کیانی

چانس مل جائے تو پھر عار کہاں ہوتا ہے
عقدِ ثانی کو تو ہر پیر جواں ہوتا ہے
اُڑ کے آ جاتے ہیں مولانا ہر اک دعوت پر
ہر جگہ آپ کو حلوے کا گماں ہوتا ہے
آج لیڈر بھی ہے چابی کے کھلونے کی طرح
شور کرتا ہے' ٹھہرتا ہے' رواں ہوتا ہے
چانس ہوتا ہے مُکر جانے کا سولہ آنے
قولِ محبوب بھی لیڈر کا بیاں ہوتا ہے
عین ممکن ہے کہ آ جائے زدِ سنسر میں
دل کا جو حال نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے
امن کا ذکر بھی کرتے نہیں تھکتے ظالم!
جن کے ہاتھوں میں سدا تیر کماں ہوتا ہے
بعض لوگوں کو تو باور ہی نہیں ہو پاتا
برتر از توند بھی کچھ کارِ جہاں ہوتا ہے
ایرے غیرے یونہی بیکار مچل جاتے ہیں
گردشِ جام پئے تشنہ لباں ہوتا ہے
میرے گھر میں میرے ہونے کا پتہ چلتا ہے
کھانسنا بھی کوئی اندازِ بیاں ہوتا ہے
کب سے بیگم کو گلہ ہے مری خوابیدگی سے
میرے ہونٹوں پہ فلاں اور فلاں ہوتا ہے

سید فہیم الدین

بک رہا ہوں آج کل ہذیان باقی خیر ہے
اور کچھ بجنے لگے ہیں کان باقی خیر ہے

بہہ رہی ہے رات بھر سے ناک، سر میں درد بھی
اِس پہ ہے زوجہ بہت ہلکان باقی خیر ہے

ہے ذرا خارش تو دادا جان کو لقوہ بھی ہے
اور ہیں بیمار دادی جان باقی خیر ہے

خیر سے منّی کو ہیضہ اور منّے کو بخار
سب سے چھوٹے کو ہوا یرقان باقی خیر ہے

فکر کی تو بات کوئی بھی نہیں ہے جانِ جاں
گھر میں ہیں بس درجنوں مہمان باقی خیر ہے

بات اب تشویش کی کوئی نہیں ایسی فہیم
دور تک ملتا نہیں انسان باقی خیر ہے

سید فہیم الدین

ہر سُو یوں پھیلا ہے اُس کے حُسن و جمال کا جادو
دنیا میں مشہور ہوا جیسے بنگال کا جادو

کمزوری پہ کہا طبیب نے ہے اسہال کا جادو
کون حقیقت کھول بتائے یہ ہے دال کا جادو

مہنگائی ہو یا ہو کرپشن سحر میں ہیں سب اس کے
مستقبل کو زیر کرے گا اپنے حال کا جادو

دنیا کے ہر شخص پہ اُس نے اپنا منتر پھونکا
ہر جادو سے بڑھ کر دیکھا یارو مال کا جادو

اب جا کر معلوم ہوئی ہے شوہر کو یہ بات
چل گیا اُس پر بے خبری میں ہی سسرال کا جادو

ڈاکٹر عزیز فیصل

دشوار کس قدر ہے یہ کہنا مرے لئے
کچھ بھی مضر نہیں ترا بھیا مرے لئے

وہ کر سکی نہ پیار میں اتنا مرے لئے
اک ادھ کو بھی نہ کہہ سکی ٹاٹا مرے لئے

کیبل پہ ایک شیف سے جلدی میں سیکھ کر
لائی وہ شملہ مرچ کا حلوہ مرے لیئے

میں نے دیا ہے رینٹ پہ سنگر کو جب سے گھر
کرتا ہے بددعائیں محلّہ مرے لئے

بیگم سے کہہ رہا تھا یہ کوئی خلا نورد
بیٹھی ہوئی ہے چاند پہ "گڑیا" مرے لئے

غیروں کو مرسڈیز پہ اس نے دلائی لفٹ
منگوایا ٹیلی فون پہ تانگہ مرے لئے

لایا میں اس کے واسطے بادام، پستہ، مغز
وہ رٹ رہی تھی دو کا پہاڑہ مرے لئے

کیوں دو مربع فٹ کے لفافے میں ڈال کر
خط اس نے "سنٹی میٹری" لکھا مرے لئے

کہنے لگی وہ ماں سے یہ شادی کے اگلے روز
کیا بچ گیا تھا بس یہ لفنگا مرے لئے؟

ڈاکٹر عزیز فیصل

مسز کمال چلی جب کمالیہ کے لئے
چڑھی وہ بس پہ فقط سات، آٹھ کا کے لئے

حریص دل کے، سنا ہے کہ، چار خانے ہیں
مکیں بھی چار ہیں درکار اس جگہ کے لئے

لغات دسیوں کھنگالی ہیں اس نے گوگل پر
کہ لفظ ڈھونڈ رہا تھا وہ بددعا کے لئے

یہ دل ہوا ہے بشیراں کے واسطے ریزرو
نہ ماریہ کے لئے ہے نہ شازیہ کے لئے

سخن پہ جاری ہے حلقے میں گفتگوئے نقد
یہی سٹیج بنا ہے الا بلا کے لئے

خلیل خان نے جنگل میں جال پھیلایا
اٹھارہ سال کی نو عمر فاختہ کے لئے

نویدصدیقی

کر رہے ہو کوششیں کیوں عقدِ ثانی کے لیے
ایک جورو کم ہے کیا ایذا رسانی کے لیے؟
متفق ہوتے نہیں گرچہ ہلالِ عید پر
"ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے"
ایسا لگتا ہے یہ ٹی وی ٹاک سے کہ اینکرز
یا لڑانے کو ہیں یا شعلہ فشانی کے لیے
دو سسر ساس،آٹھ سالے اور درجن سالیاں
ایک میں ،اتنی بلائیں زندگانی کے لیے
انقلابی سوچ کے مالک ہیں شیخِ انقلاب
چودھری جی کو رکھا ہے ترجمانی کے لیے
ایک دو کب سیکڑوں لیڈر ہیں پاکستان میں
اور ہیں اک دوسرے کی کھینچا تانی کے لیے
بادشاہی کا انھیں حق ہے جو ہیں ابنِ نواب
ہم عوام الناس ہیں بس نوحہ خوانی کے لیے
شعروارد ہورہے ہیں یوں تو ہم پر بے شمار
داد بھی درکار ہے یارو! روانی کے لیے
دیورانی نے یوں حاتم طائی کو دے دی ہے مات
ایک سوتی سوٹ لے آئی جٹھانی کے لیے
مارتے جاؤ میاں ! تم قافیے پر قافیہ
کب کوئی تیار ہے یاں قدردانی کے لیے
فیس بک پر چار میسج اس نے بھیجے ایک ساتھ
ایک اپنی ، تین نامحرم زنانی کے لیے
ریٹ رشوت کا بڑھا دیں گے ہم اگلے کام سے
بس یہی حل سوچ رکھا ہے گرانی کے لیے
این جی او سے مل کے کھائیں فنڈز سرکاری نوید
اور کریں ایسا ادب کی پاسبانی کے لیے

نویدصدیقی

وہ گھر میں تھوک کے نسوار و پان چھوڑ گیا
تمام صحن میں اپنانشان چھوڑ گیا
بچے نہ جب درودیوار ثابت وسالم
کرایہ دار بالآخر مکان چھوڑگیا
صفایا کر گیا دو تھال گوشت کا بالکل
عجیب طرز کا مہماں تھا ، نان چھوڑ گیا
کھلی فضا کاپرندہ تھاجب کنوارا تھا
وہ ہوکے شادی شدہ سب اڑان چھوڑگیا
ہوا تھا ایک ہی پیپرخراب اینوال کا
وہ سپلیمنٹری ہر امتحان چھوڑ گیا
بلایا پارک میں ملنے کو خود مجھے اس نے
پھر اپنے بھائیوں کے درمیان چھوڑ گیا
بھرا پڑا تھا سپر مارکٹ میں جس کا سٹور
جوئے میں ہار کے خالی دکان چھوڑگیا
میں ٹاک شوز کے پھندے میں یوں پھنسا،توبہ!
کہ بول چال میں شستہ زبان چھوڑ گیا
گیا نہ چھوڑ کے گھر سال تک جب اک مہماں
تو آپ اپنا ہی گھر میزبان چھوڑ گیا
مشاعرے میں تھا بے وزن شاعروں کا ہجوم
جو پڑھنے آیا وہ ذہنی تکان چھوڑ گیا
نہ تیل بیچنا آیا نہ فارسی آئی
سو! زاہدہ کا میاں زاہدان چھوڑ گیا
ہزار طرح کے قرضوں کا بوجھ گردن پر
ہمارے واسطے ہر حکم ران چھوڑ گیا
ملی نہ میٹروبس کوئی بھائی پھیرو میں
بٹھا کے ٹانگے پہ گھر کوچوان چھوڑ گیا
جسے بھی چھوکری اچھی ملی گیا گھر سے
جو پائی نوکری توخاندان چھوڑگیا
جو بزمِ شعر سے رخصت ہوئے نویدمیاں
سبھی کہیں گے کہ اک قدردان چھوڑ گیا

محمد عاطف مرزا

خون جو نکلا تو یہ جوہر کھلا
ایک گملے سے تھا اپنا سر کھلا

پیٹ بھرنے کا ہوا ہے بندوبست
شہر میں ایدھی کا اک لنگر کھلا

آپ کو دیکھا گماں ہم کو ہوا
کل تھا چڑیا گھر سے اک بندر کھلا

سبزی منڈی کی یہی پہچان ہے
ہر طرف پھرتا ہے اک ڈنگر کھلا

پیر میرا اُس میں پھر اٹکا نہیں
بھاگتے میں پاؤں سے چھتر کھلا

جاگتے میں کیا پتا لگتا ہمیں
راز ہم پر جو کھلا ، سو کر کھلا

میری بیگم سوچتی ہے آج کل
پھر رہا ہے کیوں مرا شوہر کھلا ؟

عاطفؔ اب تک جانتا کوئی نہیں
کیا کھلا ، کس سے کھلا ، کیونکر کھلا ؟

محمد عاطف مرزا

یوں علمیت کا ڈھونگ رچانا پڑا مجھے
عینک لگا کے اُس کو پٹانا پڑا مجھے

بجلی بھی آ گئی تھی، وہیں تیل ختم تھا
"جلتا ہوا چراغ بجھانا پڑا مجھے"

"ز" بھاگنے لگی تو کوئی آشنا نہ تھا
تب آشنا کو رول نبھانا پڑا مجھے

فولاد کے چنوں کا مرنڈا تھا میرے پاس
دشمن نہیں تھا کوئی تو کھانا پڑا مجھے

طرحی غزل کا پیٹ بھی بھرنا تھا دوستو!
سو قافیوں کا ڈھیر لگانا پڑا مجھے

اشعار جب کمال کے موزوں نہ ہو سکے
تب غیر کا خیال چُرانا پڑا مجھے

کھانے میں مرغ قورمہ اُس کو پسند تھا
کوا بنامِ مرغ پکانا پڑا مجھے

واں مستی کردار تھا موضوع گفتگو
سُوٹا لگا کے بزم میں جانا پڑا مجھے

عثمانی بلوچ

ساس تیری پہ مر گیا ہوں میں
تیری بیوی سے ڈر گیا ہوں میں
ساس تیری ملی مجھے اس گھر
جب کبھی پارلر گیا ہوں میں
عقد ہو نہ سکا تو کیا غم ہے
اس کو پر پوز کر گیا ہوں میں
اس کے والد نے ہے بہت مارا
جب سکینہ کے گھر گیا ہوں میں
میں بھی گورا ہوا اسی دن سے
جب سے گوری کے گھر گیا ہوں میں
اتنا مارا ہے میری بیوی نے
ٹوٹ کر اب بکھر گیا ہوں میں
خواب میں، میں نے یہ بھی دیکھا ہے
اب کنوارہ ہی مر گیا ہوں میں
شہر بھر کے تمام شر فا کو
اب تو بالغ بھی کر گیا ہوں میں
میں نے تیرا ادھارنہ کھایا
یوں بھی دل سے اتر گیا ہوں میں
تھے لطائف سبھی پٹھانوں کے
خوش مگر تجھ کو کر گیا ہوں میں
کوئی ہے غم سوار عثمانی
خود سے یوں بھی مکر گیا ہوں میں

سید افتخار حیدر

مری تحریر قاری ڈھونڈتی ہے
یہ ہرنی خود شکاری ڈھونڈتی ہے

وہ ایسے ڈھونڈتا ہے سامعیں کو
کہ جوں ویگن سواری ڈھونڈتی ہے

سنا ہے ارض۔ مغرب مختلف ہے
وہاں پر نر کو ناری ڈھونڈتی ہے

وہ پہلے پبلشر سے بات کر کے
پھر اچھا سا لکھاری ڈھونڈتی ہے

اسے صحرا میں پیدل بھاگنا ہے
کہاں لیلیٰ مہاری ڈھونڈتی ہے

چلو پکڑو میاں اب گھر کا رستہ
تمھیں بیوی تمھاری ڈھونڈتی ہے

روبینہ شاہین بیناؔ

کیسا کردار ہے لیڈر کا بتا ہی دیں گے
بہرِ آئینہ اُسے ایک توا ہی دیں گے
حرص کرسی کی ہر اک لیڈرِ قومی میں ہے
پھر بھی دعویٰ ہے تمھیں ملک نیا ہی دیں گے
میٹرو بس کا یہ ٹینڈر تو نکل جانے دو
راستہ زیست کا دشوار بنا ہی دیں گے
پلس والوں کی ٹریننگ بھی ابھی جاری ہے
دھرنے والوں کو کسی روز اٹھا ہی دیں گے
گو مسائل کا یہ انبار اٹھا رکھا ہے
پھر بھی ہم سر پہ شریفوں کو بٹھا ہی دیں گے
تم چراتے ہو مرے پیڑ سے جامن لیکن
کھل گیا ڈاگ تو جامن بھی دہائی دیں گے
اپنی تعلیم مکمل میں کروں گی اس پر
کمپیوٹر جو مجھے ظلِ الٰہی دیں گے
میں نے چیٹنگ پہ بھی فرہاد بنا رکھے ہیں
فیس بکیئے بھی مرے دل کی گواہی دیں گے
مولوی لوگ ہیں بارات سے آگے آگے
ساتھ حلوے کے ہمیں گوشت کڑاہی دیں گے
روئی ٹھونسی ہے جو کانوں میں نکالو بیناؔ
شعر دوچار تمھیں ہم بھی سُنا ہی دیں گے

ہاشم علی خان ہمدمؔ

کیوں نہ جواب دے سکا میرے خطاب کا
میں منتظر ہوں آج بھی اس کے جواب کا
پڑھتے ہیں وال وال پر عاشق حسیں کلام
ہے فیس بک سے واسطہ دل کی کتاب کا
مچھر نے جاں بچائی ہے کھڑکی سے کود کر
دیکھا ہے یہ کمال بھی تیری جراب کا
کچھ تو خیالِ خاطرِ احباب چاہیے
بگڑا ہوا ہے موڈ کیوں عالی جناب کا
آنے لگے ہیں یاد پھر لولی شرارتیں
کھولا ہوا ہے طاقچہ دل کی کتاب کا
اک مینڈکی کو ہیر تھا مینڈک سے اس طرح
تالاب میں ملادیا مٹکا شراب کا
تنقید کر رہا تھا میں علمِ عروض سے
اردو میں دے رہا تھا میں پرچہ حساب کا
انگلینڈ جا کے فل فلیج انگریز بن گیا
گویا غلام خان تھا بچہ نواب کا
دھرنے کے آس پاس ہی منڈلا رہا تھا میں
کھینچے ہوئے تھا مجھ کو بھی میلہ شباب کا
بجلی بچانا دوستو کارِ ثواب ہے
لیکن جو بل ملا ہے وہ ہے کس عذاب کا
جی چاہتا ہے گوشت میں ہڈی کو دیکھ کر
ٹوکہ اٹھا کے بھاگ لوں میں بھی قصاب کا
جھپکی نہیں ہے آنکھ بھی ٹی وی کے سامنے
اصلی بنا دیا گیا منظر سراب کا
رنڈوے سے پوچھتا تھا ہمدمؔ پٹھان دوست
چھوڑا ہے جان کس طرح خانہ خراب کا

روبینہ شاہین بیناؔ

جانے ادبی مقامات کی الاٹمنٹس کا ٹھیکہ ادب کے کن پٹواریوں کے ہاتھ میں ہے کہ اب تک شورش برپا ہے۔ سری ادب تو ایک طرف رہا، اُن ادباء و شعراء کے ساتھ بھی ڈنڈی ماری گئی ہے جنھوں نے اپنی ساری زندگی گلشنِ ادب کی آبیاری میں غرق کر دی لیکن اگلوں نے اُن کے کلام کو قابلِ اعتناء ہی خیال نہ کیا۔ نظیر اکبر آبادی اس کی ایک مبینہ مثال ہیں۔

اُردو نظم میں سیّد محمد ولی نظیر کا جداگانہ مقام ہے۔ آپ نے اپنے ذاتی رجحان کے باعث دونوں دبستانوں سے اپنی حیثیت الگ رکھی۔ دونوں دبستانوں سے جداگانہ حیثیت کی وجہ سے آپ سے اکثر بے اعتنائی برتی گئی اور آپ اور آپ کا فن گمنام جزیرے کی مانند رہا۔ شیفتہؔ نے تو اُنھیں شعراء میں ہی شمار نہیں کیا۔ شیفتہ گلشنِ بے خار میں لکھتے ہیں:

" نظیر اکبر آبادی کے بہت سے اشعار سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں اور ان اشعار پر نظر رکھتے ہوئے اسے شعراء کی صف میں شمار نہیں کرنا چاہیئے۔"

سید احمد دہلوی لکھتے ہیں

" بعض دہلی کے تذکرہ شعراء جمع کرنے والوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ایک ملائے مکتبی، صحتِ الفاظ سے معراء پُرگو اور عوام الناس کی بلکہ جہلاء کی زبان لکھنے والا تھا لیکن میری رائے میں وہ ہندوستان کا شیکسپئر اور نظریاتی اور قدرتی مضامین کے بیان میں یدِ طولیٰ رکھنے والا تھا۔ اُس نے ادنیٰ سے ادنیٰ اور رکیک سے رکیک مضامین کو اس خوبی سے باندھا ہے اور عمدہ نتیجہ نکالا ہے کہ دوسرا نہیں نکال سکتا۔"

دیگر وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غدر سے قبل کی شاعری پر ایرانی روایات کی گہری چھاپ تھی ۔ بلکہ یہ روایات خالص ایرانی تھی اور برصغیر کے ادبی منظر نامے میں اسے اُردو ادب سے منسوب نہیں کیا جاتا تھا۔

طنزیہ اور مزاحیہ موضوعات میں ندرت اور طباعی اور ان کے بیان میں اسالیب کا تنوع اگر ایک جگہ کسی ایک شاعر کے کلام میں تلاش کیا جا سکتا ہے تو وہ نظیر اکبر آبادی ہیں۔ نظیر کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اُس نے شاعری کے دو بڑے قطبین کے ہوتے ہوئے اپنے لیے نئی سمت اور رجحان کا تعین کیا اور کسی گھنے پیڑ کے نیچے پناہ لینے کی بجائے اپنا الگ گلشن آباد کرنے کی سعی کی۔ باوجودیکہ کہ دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دہلی اپنے عروج پر تھے مگر نظیر نے اپنی آزاد طبع کے تحت اپنے آپ کو ان دونوں دبستانوں سے مکمل طور پر علیٰحدہ رکھا، نہ صرف سوچ کے حوالے سے بلکہ صنفِ سخن کے اعتبار سے بھی وہ دور رہے۔

پروفیر آل احمد سرور نظیر کی مزاح نگاری کا اعتراف اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

"میں نظیر کو علاوہ خصوصیات اور مزاح کے ایک مزاح نگار اس لئے بھی مانتا ہوں کہ وہ زندگی کے

تضادات اور عجائبات کو ہاں کہتا ہے، ان پر کڑھتا نہیں۔ جو نماز پڑھتا ہے وہ بھی آدمی ہے اور جو نمازیوں کے جوتے چراتا ہے وہ بھی آدمی ہے۔ برسات میں جو گھر کے دروازے پر آکر کیچڑ میں پھسل جاتا ہے، وہ بھی زندگی کے حادثات کا نقشہ دکھا کر ہمیں محظوظ کرتا ہے"۔

(پروفیسر آل احمد سرور: اُردو میں طنز و مزاح: سہ ماہی ادیب علیگڑھ)

شوکت علی سبزواری کا خیال ملاحظہ ہو:

"نظیر کے یہاں زندگی کی اہمیت ہے۔ اس کا اجتماعی شعر بہت تیز تھا۔ سماج کا کوئی پہلو اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ اس کی نظر تفصیلی تھی۔ وہ ایک ہوشیار نشتر زن کی طرح فصاد کو دیکھ کر نشتر استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کی نظر میں حکیمانہ گہرائی ہے۔۔۔۔ نظیر کا کمال یہ ہے کہ اُس نے زندگی کے متنوع اور گوناگوں رنگوں کے تقابل سے مزاح اور طنز پیدا کیا ہے"۔

(شوکت سبزواری: علیگڑھ میگزین۔ طنز و ظرافت نمبر 1953)

پروفیسر شہباز نے نظیر کو انشاء کے ساتھ رکھا ہے اور ان دونوں کا تقابلی تجزیہ کیا ہے۔ موصوف کے خیال میں:

"بہت سی باتیں دونوں شعراء کے کلام میں یکساں اور متحد ہیں۔ بعض سخت قافیوں پر دونوں طبیعت آزمائی کرتے ہیں اور اس قسم کے قافیوں سے دونوں کو ایک قسم کا عشق معلوم ہوتا ہے۔ کلام میں چوچلے کو دونوں شعراء شریک کرتے ہیں۔ دونوں شعراء آزادوں کے لہجے میں اکثر خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ ظرافت کے مضامین دونوں کے کلام میں بڑے زور سے دخل پاتے ہیں شاعر کو اکثر دونوں کے کلام میں ایک بہروپئے کا کریکٹر دیا گیا ہے"۔

(پروفیسر شہباز: مضمون "زندگانی بے نظیر")

نیاز فتح پوری نے نظیر کو چٹکلے باز شاعر قرار دیا ہے۔ اپنی اس صفت کا احساس خود شاعر کو بھی تھا۔

لاکر ہر اک ادا سے وہ عیارِ چٹکلہ
چٹکی بجا کے چھوڑے ہے ہر بار چٹکلہ
سب جانتے ہیں چٹکلے بازی نظیر کی
اُس کی تو ہر ادا میں ہے اے یار چٹکلہ

نیاز فتح پوری چٹکلے باز شخص کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کی رنگینیِ طبع اکتسابی نہیں بلکہ اکثر وہبی ہوتی ہے اور اس لئے وہ کبھی موقع پر چوکتا نہیں اور ہونٹوں پر آئی ہوئی بات کو روکتا نہیں۔ بولی ٹھولی، ضلع جگت، پھبتی، فقرہ بازی، بذلہ سنجی میں مشاق ہوتا ہے اور محفل کا جو رنگ ہوتا ہے اُس میں ڈوب جاتا ہے"

(پروفیسر نیاز فتح پوری: نظیر میری نظر میں: نگار "نظیر نمبر")

ڈاکٹر وزیر آغا نظیر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"نظیر کی شاعری کو صرف اُس کے اجتماعی شعور کی بنأ پر اہمیت حاصل نہیں اس کی اہمیت کی ایک وجہ اس کا مزاحیہ وطنزیہ لہجہ اور مسرت و بہجت کا اظہار بھی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ نظیر اُردو کے وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے نہ صرف شعر کو ملک کے جیتے جاگتے ماحول سے قریب تر لانے کی سعی کی بلکہ ہجو کی محدود کینہ پروری سے نکل کر طنز و مزاح کے وسیع اطلاق کی طرف بھی متوجہ ہوئے تھے"

(ڈاکٹر وزیر آغا: اُردو ادب میں طنز و مزاح)

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں اُردو کے طنز و مزاح کے اجزأ شامل ہیں:

بیٹھے بٹھائے خلد میں ابلیس نے نظیر
کیا دم دیا ہے حضرتِ آدم کو دیکھئے

بالفرض اگر ہم ہوئے حوا کے شکم سے
آدم کے تئیں پوچھئے یہ کس کا جنا ہے

غور سے دیکھا تو اب یہ مثل ہے وہ اے نظیر
باپ نے پدڑی نہ ماری بیٹا تیرانداز ہے
میں ہوں پتنگ کاغذی، ڈور ہے اُس کے ہاتھ میں
چاہا اِدھر گھٹا لیا ، چاہا اُدھر بڑھا لیا
کل شب وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھڑیاں
آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے
اب تو ذرا سا گاؤں ہے بیٹی نہ دے اسے
لگتا تھا ورنہ ''چین'' کا داماد آگرہ
اسے میں چھوڑوں اور چاہوں تمہیں اے بی یہ ممکن ہے؟
عجب تم بھی کوئی اُلن، سڑن، خبطن، دیوانی ہو
جنت کے لیے شیخ جو کرتا ہے عبادت
کی غور جو ظاہر میں تو مزدور کی سوجھی

نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں طنزیہ اشعار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول اشعار جو خود اپنی ذات سے متعلق ہیں جبکہ دوسرا وہ حصہ ہے جا کا تعلق معاشرے سے ہے۔ نظیر نے سب سے پہلے خود اپنی خامیوں کا جائزہ لیا اور پھر دوسروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ خود اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنانا شرافتِ نفس کی آخری حد ہے۔

اب تلک دھن ہے حسن دنداں کی
دیکھ اِس پوپلے نظیر کی عرض

بڑھاپے کے بارے میں مسدس میں بھی اپنی ذات کو نشانے بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

کیا یارو اُلٹ ہم سے گیا ہائے زمانہ
جو شوخ کہ تھے اپنی نگاہوں کا نشانہ
چھیڑے ہے کوئی ڈال کے دادا کا بہانہ
ہنس کر کوئی کہتا ہے کہاں جاتے ہو نانا

محلہ تاج گنج سے ٹٹو پر سوار ہو کر مائی تھان آتے ہوئے ایک روز ٹٹو نے شوخی کی۔ چابک ہاتھ میں تھا، گھما کے رسید کیا۔ ایک راہگیر بھی قریب ہی تھا، اُس کے وہ لگتا ہوا ٹو کو لگا۔ اُس نے کہا میرا کیا قصور تھا کہ صبح صبح چابک سے خبر لی۔ میاں نظیر اُتر پڑے اور اُس سے معافی کے خواستگار ہوئے اور زبردستی اُس کے ہاتھ میں چابک دے کر کہا۔۔۔ میاں ایک میرے بھی جڑ دو تا کہ بدلہ ہو جائے۔ وہ تو کہہ کر چھوٹا یا مگر انہوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ مجبور ہو کر اُس نے چابک نظیر میاں کے چھوا اور چلتا بنا۔ اس تاریخ سے پھر چابک ہاتھ میں نہیں لی۔ ٹٹو اپنی رائے سے چلتا اور منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا۔

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اسی طرح نظم ''برسات'' میں پھسلن کا بار بار ذکر کرتے کرتے مقطع کے بند میں نظیر نے خود اپنے پھسلنے پر بھی طنز کیا ہے
آخر کو واں نظیر بھی آکر پھسل گیا

اب ذرا وہ مثالیں بھی ملاحظہ ہوں جہاں شاعر نے سماج اور معاشرے کو اپنی ٹھٹھہ بازی کا نشانہ بنایا ہے۔ نظم آدمی نامہ سماج پر طنز کی ایک بہت پُر کیف، خوش آئند اور ظریفانہ مثال ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے اے میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی نماز اور قراں یہاں
اور آدمی ہیں اُن کی چراتے ہیں جوتیاں

جواُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ہے۔

یہ نظم تقابلی طنز کی بہترین مثال ہے۔نظیر کی اِس نظم کو ڈاکٹر فیلن نے بھی بڑی اہمیت دی ہے۔اس نظم میں شاعر نے مزاح کا عنصر شامل کر کے طنز کو ہنسی، دل لگی کی بات بنا دیا ہے۔

سماجی طنز کے موضوع پر اُن کی ایک نظم ''دنیائے دوں کے تماشے'' ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔اس نظم میں ملک کے سماجی، اخلاقی اور کاروباری حالات کی ابتری پر واقعاتی تبصرہ کیا گیا

گدھا لڑائی میں ہاتھی کے تئیں لتاڑے ہے
شتر کے گھر کے تئیں لومڑی اجاڑے ہے
ہما کو بوم ہر اک وقت مارے ڈھاڑے ہے
غضب ہے پودنا سارس کے پر اکھاڑے ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

نظیر اکبر آبادی کا ایک شعر

پہلا مصرع

ایک دن باغ میں جا کر، چشم حیرت زدہ وا کر، جامہ صبر قبا کر، طائر ہوش اڑا کر شوق کو راہ نما کر، مرغ نظارہ اڑا کر، دیکھی رنگت جو چمن کی، خوبی نسرین وسمن کی شکل غنچوں کے دہن کی، تازگی لالہ کے تن کی، تازگی گل کے بدن کی، کشت سبزے کی، ہری تھی، نہر بھی لہر بھری تھی، ہر خیاباں میں تری تھی، ڈالی ہر گل کی ہری تھی، خوش نسیم سحری تھی، سرو شمشاد وصنوبر، سنبل وسوسن وعرعر نخل میوے سے رہے بھر، نفس بادِ معنبر، درو دیوار معطر، کہیں قمری تھی مطوق، کہیں انگور معلق، نالے بلبل کے مدقق، کہیں غوغاء کی بق بق، اس قدر شاد ہوا دل، مثل غنچے کے گیا کھل غم ہوا کشتہ وبسمل شادی خاطر سے گئی مل، خرمی ہو گئی حاصل، روح بالیدہ ہو آئی، شان قدرت نے دکھائی جان سے جان میں آئی، باغ کیا تھا گویا اللہ نے اس باغ میں جنت کو اتارا

دوسرا مصرع

ناگہاں صحن چمن میں، مجمع سرو وسمن میں، جیسے ہو روح بدن میں، جیسے ہو شمع لگن میں جیسے خورشید کرن میں، ماہ پروین وپرن میں، دیکھا اک دل بر رعنا، وطرحدار جفا کار، دل آزار نمودار، نگہ ہمسر شمشیر، مژہ ترکش پر تیر، سر زلف گرہ گیر، دل خلق کی زنجیر، جبیں نور کی تصویر، وہ رخ شمس کی تنویر، زباں شہد بیاں شیر، نظر روح کی اکسیر، دہن غنچہ خاموش سمن برگ بر دوش، سخن بحر گہر جوش، بدن سرو قبا پوش، چھڑی گل کی ہم آغوش، وفا رحم فراموش، ہر اک آن ستم کوش، عجب حسن دل آرا، نہ کبھی مہر نے دیکھا، نہ کبھی ماہ نے دیکھا، نہ کسی فہم میں آیا، نہ تصور میں سمایا، وہ نظر مجھکو جو آیا، مجھے حسن اپنا دکھایا، دل نے اک جوش اٹھایا جی نے سب ہوش اڑایا، سر کو پاؤں پہ جھکایا، اشک آنکھوں سے بہایا، اس نے جب یوں مجھے پایا، یہ سخن ہنس کے سنایا، کہ 'تو ہے عاشق شیدا، لیکن عاشق نہیں پیدا، ہووے تجھ پر یہ ہویدا، کہ اگر ہم کو تو چاہے یا محبت کو نباہے، نہ کبھی غم سے کراہے، نہ کسی غیر کو چاہے نہ کبھی گل کی طرف دیکھ، نہ سنبل کی طرف دیکھ، نہ بلبل کی طرف دیکھ، نہ بستاں پہ نظر کر نہ گلستاں میں گذر کر، چھوڑ دے سب کی مودت، ہم سے رکھ دل کی محبت، ایسے میں ہم بھی تجھے چاہیں، تجھ سے الفت کو نباہیں، ہیں یہی چاہ کی راہیں، گر یہ مقدور تجھے ہو، اور یہ منظور تجھے ہو، تو نظیر آج سے تو چاہنے والا ہے ہمارا

(کلیات نظیر: مرتب ومدون [illegible] عبدالباری: مکتبہ شعروادب، سمن آباد، لاہور)

اِس کی بھی اور ہماری یارو خبر خدا لے
سب بیچتے ہیں آ کر چیتے کھرے کا بچہ
ہم بیچتے ہیں یارو لو اژدھے کا بچہ

نظیر اکبر آبادی اس وجہ سے بھی نقادوں کے تیر زنی کا شکار رہے ہیں کیونکہ اُن کے کلام میں عریانیت کا عنصر بھی موجود ہے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اُن کے فن مین عریانیت کی اہم وجہ اُن کی حد سے زیادہ واقعت پسندی ہے، اس کا مقصد بھانڈ پن یا پھکّو پن نہیں ہے۔ واقعت پسندی کی رو میں نظیر کبھی اپنی اصلی متانت اور سنجیدہ ظرافت کی جائز حد سے بھی آگے نکل جاتے ہیں تاہم مجموعی طور پر نظیر کی ظرافت میں بازاریت اور خشونت کی جگہ متانت اور درد پایا جاتا ہے مثلاً برسات کی بہاریں، موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں، مفلسی، پیسہ، پیسہ ہی سب کچھ کرتا ہے، آٹے دال کی فکر کرو، روٹیاں، پیٹ، بڑھاپا وغیرہ وغیرہ۔

نظیر کی شاعری کو پڑھ کر یہ احساس شدت سے پیدا ہوتا ہے کہ نظیر نے منظر نگاری کرتے ہوئے منظر کو صرف ضمنی انداز سے پیش نہیں کیا بلکہ اُس کو زندہ وجاوید کر کے اُس میں اپنی روح پھونک دی اور الفاظ کی طاقت سے منظر آنکھوں کے گرد گھومتے ہوئے دکھایا۔ شاید اُن کی تمثال میں پختگی نہ تھی مگر ابتدائی خدوخال ضرور تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اُن کی شاعری میں منظر نگاری، تصور کاری کے ساتھ "فوٹو جینک" عنصر زیادہ واضح اور اُبھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر کہیں کہیں اُس میں ذاتی احساسات وجذبات بھی در آتے ہیں۔ اور یہی اُن کا اپنا ذاتی مزاج تھا۔

انہوں نے اپنی نظموں میں کچھ ایسے تمثالی عناصر پیدا کیے جو آج تک آنکھوں کے سامنے ایک تصویری شکل میں آتے ہیں۔ مثلاً "بٹ مار"، "نقارہ"، "موت" ایسے الفاظ ہیں جن کو خاص معنی اور مفہوم دے کر اپنے جذبات احساسات، میلانات کا نمائندہ بنا لیا ہے۔ مثلاً "کبڑی نامہ" کے اس بند پہ غور کریں:

یہ اسپ بہت اُچھلا کودا، اب کوڑا مارو زیر کرو

نظیر اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی تھے شاعرِ جمہور
نہیں تھا ذہن میں جن کے کسی طرح کا فتور
دشہرا ہو کہ دیوال، ہو عید یا ہولی
ہر ایک جشن مناتے تھے ہو کے وہ مسرور
دشہرا ہو کہ دیوالی، ہو عید یا ہولی
ہر ایک جشن مناتے تھے ہو کے وہ مسرور
ہر ایک حال میں رہتے تھے وہ عوام کے ساتھ
ہر ایک حال میں دیتے تھے وہ عوام کا ساتھ
نظر میں ان کی تھے یکساں کسان اور مزدور
قلندرانہ روش پر تھے کارمند سدا
بقائے باہمی ان کا تھا عمر بھر دستور
عوامی رنگ تھا ان کے کلام میں غالب
نظر میں ان کی ہمیشہ تھا کُلبۂ بے نور
کبھی کیا نہیں اپنے ضمیر کا سودا
تھا ان کے رنگِ سخن میں صداقتوں کا وفور
صدائے حق کو ہمیشہ بلند کرتے رہے
تھے اپنے وقت کے برقیؔ وہ سرمد و منصور

احمد علی برقی اعظمی

نظیر اکبر آبادی

تھے نظیر اک شاعرِ جادو بیاں
جا بجا ہیں جن کی عظمت کے نشاں
اُن کی فکر و فن کا دلکش امتزاج
اُن کی اردو شاعری سے ہے عیاں
اُن کی نظموں کے یہ دلکش شاہکار
ہیں سمو فکر و فن پر ضوفشاں
تھے عوامی زندگی کے وہ نقیب
جن کے ہیں مداح سب پیر و جواں
اب کہاں ہیں ایسے شاعر اور ادیب
جن کو حاصل ہے حیاتِ جاوداں
وہ تھے اقلیمِ سخن کے تاجدار
جو دلوں پر آج تک ہے حکمراں
کیسے مٹ سکتے ہیں برقیؔ اعظمی
اُن کی نظموں کے نقوشِ جاوداں

احمد علی برقیؔ اعظمی

جب مال اکٹھا کرتے تھے اب تن کا اپنا ڈھیر کرو
گڑھ ٹوٹا لشکر بھاگ چکا، اب میاں میں تم شمشیر کرو
تم صاف لڑائی ہار چکے اب بھاگنے میں مت دیر کرو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا
سر کانپا، چاندی بال ہوئے منہ پھیلا پلکیں آن جھکیں
قد ٹیڑھا کان ہوئے بہرے اور آنکھیں بھی چندھیائے گئیں
سکھ نیند گئی اور بھوک گئی، دل سست ہوا آواز نہیں
جو ہونی تھی سو ہو گزری اب چلتے ہیں کچھ دیر نہیں

نظیر جب اپنی نظموں میں بہار خزاں، برسات، میلے ٹھیلے یا تیوہاروں کا ذکر کرتے ہیں تو فرضی اور خیالی سماں پیش کرنے کے بجائے وہ ہندوستانی موسموں تیوہاروں اور روایات کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔انھوں نے غزل گوئی ترک کر کے نظم گوئی اختیار کی۔ان کے کلام کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن کی ہر چیز سے نہ صرف محبت کرتے تھے بلکہ اس پر فخر کرتے تھے۔ان کی تلمیحات اور تشبیہات بھی خاص ہندوستانی ہیں۔ان کا موضوع عوامی زندگی ہے ان کی نظموں کا انداز صاف اور سلیس ہے بلکہ فطری ہے۔موجودہ نیچرل شاعری نظیر کا فیضان ہے۔مثال کے طور پر "برسات کی بہاریں" نظم کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہم سچ مچ ہندوستانی برسات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

مارے ہے موج ڈابر دریا ڈھونڈ رہے ہیں
مور و پپیہے کوئل کیا گیا ڈمنڈ رہے ہیں
جھڑ کر رہی ہیں ندیاں نالے امنڈ رہے ہیں
برسے ہے مینھ جھڑا جھڑ بادل گھمنڈ رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہندوستان کے موسموں کا بیان نظیر نے جس حقیقت پسندانہ انداز میں کیا ہے، اس کی مثال کہیں کہیں اور نہیں ملتی۔

نظیر نے لفظوں سے تصویر کشی کی جو روایت چھوڑی ہے وہ ہنوز کسی بھی شاعر میں دکھائی نہیں دیتی۔ایسی مرقع نگاری انگریزی شاعر کے مورثِ اعلیٰ چاسر کے یہاں نظر آتی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ چاسر نے ہر طبقہ اور ہر جماعت کی تصویریں اتاری ہیں جبکہ نظیر نے اس امر کا اہتمام نہیں رکھا اور صرف جمہور کے روز مرہ زندگی سے واسطہ رکھا۔

غرضیکہ طنز و ظرافت کے لحاظ سے نظیر کے کلام کی اہمیت مسلم ہے اور ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری اپنی گوناں گوں صفات کی وجہ سے تاریخ ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل لاہور، ۲۸۹۱ء، ص ۰۱۱

۲۔ اظہر راہی، دیباچہ، نظیر اکبر آبادی کا منتخب کلام، ۲۲ نومبر ۱۹۷۲ء

۳۔ محمد صادق، ڈاکٹر، تاریخ اُردو ادب (انگریزی)، س ن، ص ۲۶۱

۴۔ سلیم جعفر، نظیر اکبر آبادی کا تغزل، مشمولہ زمانہ، ماہنامہ کانپور، ۳۳۹۱ء، ص ۸

۵۔ شیفتہ مصطفیٰ خان، نواب، گلشنِ بے خار، ترجمہ محمد احسان الحق فاروقی، ص ۹۱۵

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، طبع پنجم، ۲۰۰۲ء، ص ۹۱۲

۷۔ فرحت اللہ بیگ، مقدمہ دیوان نظیر اکبر آبادی

۸۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، نظیر نامہ، شمس الحق عثمانی (مرتبہ)، دہلی، ۹۷۹۱ء، ص ۱۳۳

۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا مزاج، مجلسِ ترقی؟ ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۴۳

۱۰۔ شیفتہ مصطفیٰ خان، نواب، گلشنِ بے خار، لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۴۷۹۱ء ‖ ص ۱۷

۱۱۔ سید طلعت حسین نقوی، نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری، ۳۹۹۱ء، ص ۱۲

۱۲۔ نیاز فتح پوری، نظیر میری نظر میں، مشمولہ نظیر نامہ (مرتب شمس الحق عثمانی)، ۹۷۹۱ء، ص ۱۰۱

۱۳۔ عبدالمومن الفاروقی، دیباچہ و مقدمہ، کلیاتِ نظیر اکبر آبادی، ۵ جولائی ۱۹۵۱ء

☆☆☆☆

نمونہ کلام:

روٹی

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
سینے اوپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا
کرتا پھرے ہے کیا وہ اُچھل کود جا بجا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اُچھل گیا
ٹھٹھا ہنسی شراب صنم ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی چولہا توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اُس جا ظہور ہے
چولہے کی آگ آنچ جو جلاتی حضور ہے
جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کی سب نظر آتی ہیں روٹیاں

آوے تاوے تنور کا جس جا زبان پہ نام
یا چکی چھوکے کا جہاں گلزار ہو تمام
واں سر جھکا کے کیجئے ڈنڈوات اور سلام
اس واسطے کہ خاص یہ روٹی کے ہیں مقام
پہلے انہی مکانوں میں آتی ہیں روٹیاں

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں پور پور
آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھان چھان گرے ہے نور
پیڑا ہر اک اس کا ہے برفی و موتی چور
ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھے نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہیئے یہ ہے دل کا نور کیا
اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے شعور کیا
کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی جب آئے پیٹ میں سو قند گھل گئے
گلزار پھولے آنکھوں میں اور عیش تل گئے
دو تر نوالے پیٹ میں جب آ کے ڈھل گئے
چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید کھل گئے
یہ کشف یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو
میلے کی سیر خواہشِ باغِ چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

اب جن کے آگے مال پوئے بہار کے تھال ہیں
پوری بھگت انہی کی وہ صاحب کے لال ہیں
اور جن کے آگے روغنی اور شیر ہیں
عارف وہی ہیں اور وہی صاحبِ کمال ہیں
پکی پکائی اب جنھیں آتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
لمبے کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہے روٹی کے واسطے
سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے
جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہے خمیر
روکھی بھی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد و شیر
یہ پتلی ہوئے موٹی خمیری ہو یہ خاطیر
گیہوں جو اور باجرے کی جیسی ہو نظیر
ہم کو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

کل جُگ

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے دُکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے

کانٹا کسی کے مت لگا گو مثل گل پھولا ہے تو
وہ تیرے حق میں تیر ہے کس بات پر بھولا ہے تو
مت آگ میں ڈال اور کو پھر گھانس کا پولا ہے تو
سن رکھ یہ نکتہ بے خبر کس بات پر بھولا ہے تو
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاوے گا
گیہوں سے گیہوں، جَو سے جَو، چاول سے چاول پاوے گا
جو آج دیوے گا یہاں ویسا وہ کل واں پاوے گا
کل دیوے گا کل پاوے گا کلپاوے گا کل پاوے گا
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے

جو چاہے لے چل اس گھڑی سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے، آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں دریا کی یہ منجدھار ہے
اوروں کا بیڑا پار کر تیرا بھی بیڑا پار ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے

تو اور کی تعریف کر، تجھ کو ثنا خوانی ملے
کر مشکل آساں اور کی تجھ کو بھی آسانی ملے
تو اور کو مہمان کر تجھ کو بھی مہمانی ملے
روٹی کھلا روٹی ملے، پانی پلا پانی ملے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے

کر چُک جو کچھ کرنا ہو اب یہ دم تو کوئی آن ہے
نقصان میں نقصان ہے احسان میں احسان ہے
تہمت میں یاں تہمت لگے طوفان میں طوفان ہے
رحمان کو رحمان ہے شیطان کو شیطان ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے

یاں زہر دے تو زہر لے شکّر میں شکّر دیکھ لے
نیکوں کو نیکی کا مزا موذی کو ٹکر دیکھ لے
موتی دے موتی ملے پتھر میں پتھر دیکھ لے
گر تجھ کو یہ باور نہیں تو تو بھی کر کر دیکھ لے
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے

غفلت کی یہ جاگہ نہیں یاں صاحب ادراک رہ
دل شاد رکھ دل شاد رہ، غمناک رکھ غمناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیر اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکاں ہے او میاں یاں پاک رہ بیباک رہ
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے

آدمی نامہ

دنیا میں بادشا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال و قُطب و غوث و وَلی آدمی ہوئے
منکِر بھی آدمی ہوئے اور کُفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے، کشف و کرامات کے کیے
حتیٰ کے اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہتا تھا بر ملا
یہ بات ہے سمجھنے کی، آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے، اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے، اور آدمی ہی دور
کُل آدمی کا حُسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطان بھی آدمی ہے، جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی، امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی، قرآن اور نماز، یاں
اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو مارے ہے آدمی
اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

ناچے ہے آدمی ہی، بجا تالیوں کو یار
اور آدمی ہی ڈالے ہے اپنی ازار اتار
ننگا کھڑا ، اُچھلتا ہے، ہو کر ذلیل و خوار
سب آدمی ہی ہنستے ہیں ، دیکھ اس کو بار بار
اور وہ جو مسخرا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی، مسافر ہو، لے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے، پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے ، اور آدمی ہی جال
ساں بھی آدمی ہی، نکلتا ہے میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے، اور آدمی بیاہ
قاضی وکیل آدمی، اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں، خوانخواہ
دوڑے ہیں آدمی ہی مشعلیں جلا کے واہ
اور بیاہنے چڑھا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو، بولے ہے بار بار
اور آدمی ہی پیادے ہیں، اور آدمی سوار
حقہ، صراحی، جوتیاں، دوڑیں بغل میں مار
کاندھے پہ رکھ کے پالکی، ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی، دکانیں لگا لگا
کہتا ہے کوئی لو، کوئی کہتا ہے، لا رے لا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں، سر رکھ کے خوانچہ
کس کس طرح سے بیچیں ہیں، چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

طبلے، منجیرے، دائرے، سارنگیاں بجا
گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جا بجا
ان کو بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا
وہ آدمی ہی ناچے ہیں، اور دیکھو یہ مزا
جو ناچ دیکھتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی، لعل و جواہر ہے، بے بہا
اور آدمی ہی خاک سے بد تر ہی ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے، اور اُلٹا ہے جُوں توا
گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا سا چاند کا
بدشکل و بدنما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کی، یہ کچھ زرق برق ہیں
روپے کے ان کے پاؤں ہیں، سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے، تا بہ شرق ہیں
کمخواب، تاش، شال، دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اک ایسے ہیں کہ، جن کے بچھے ہیں نئے پلنگ
پھولوں کی سیج ان پہ جھمکتی ہے تازہ رنگ
سوتے ہیں لپٹے چھاتی سے، معشوق، شوخ وشنگ
سوسو طرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ
اور خاک میں پڑا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

حیراں ہوں یارو، دیکھو تو، کیسا یہ سوانگ ہے
یاں آدمی ہی چور ہے، اور آپ ہی تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی، اور کہیں مانگ تانگ ہے
دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثل رانگ ہے
فولاد سے گھڑا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی، کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتےہیں، کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں، روتے ہیں زار وزار
سب آدمی ہی کرتے ہیں، مردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے، لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت بھی، اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں، اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

خوشامد

دل خوشامد کا ہر اک شخص کا کیا راضی ہے
آدمی جن و پری بھوت و بلا راضی ہے
بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے
شاہ مسرور غنی شاد گدا راضی ہے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجے
اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجے
انبیا اولیا اور رب کی خوشامد کیجے
اپنے مقدور غرض سب کی خوشامد کیجے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کے سلام
وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام
بڑے عاقل بڑے دانا نے نکالا ہے یہ دام
خوب دیکھا تو خوشامد کی ہی آمد ہے تمام
جوخوشامد کرے خلق اُس سے سداراضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پیار سے جوڑ دئے ہاتھ طرف جس کے آہ
وہی خوش ہو گیا کرتے ہی وہ ہاتھوں پہ نگاہ
غور سے ہم نے جو اِس بات کو دیکھا واللہ
کچھ خوشامد ہی بڑی چیز ہے اللہ اللہ
جوخوشامد کرے خلق اُس سے سداراضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

عیش کرتے ہیں وہی جن کا خوشامد کا مزاج
جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ محتاج
ہاتھ آتا ہے خوشامد سے مکان ملک اور راج
کیا ہی تاثیر کی اس نسخے نے پائی ہے رواج
جوخوشامد کرے خلق اُس سے سداراضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

جو کہ کرتے ہیں خوشامد وہ بڑے ہیں انساں
جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ حیراں
ہاتھ آتے ہیں خوشامد سے ہزاروں ساماں
جس نے یہ بات نکالی ہے میں اُس کے قرباں
جوخوشامد کرے خلق اُس سے سداراضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

ہم نے ہر دل میں خوشامد کی محبت دیکھی
پیار اخلاص و کرم مہر و مروت دیکھی
دلبروں میں بھی خوشامد ہی کی الفت دیکھی
عاشقوں میں بھی خوشامد ہی کی چاہت دیکھی
جوخوشامد کرے خلق اُس سے سداراضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مرد و زن طفل و جوں خورد و کلاں پیر و فقیر
جتنے عالم میں ہیں محتاج و گدا شاہ وو زیر
سب کے دل ہوتے ہیں پھندے میں خوشامد کے اسیر
تو بھی واللہ بڑی بات یہ کہتا ہے نظیر
جوخوشامد کرے خلق اُس سے سداراضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پیٹ

کرتا ہے کوئی جور و جفا پیٹ کے لئے
سہتا ہے کوئی رنج و بلا پیٹ کے لئے
سیکھا ہے کوئی مکر و دغا پیٹ کے لئے
پھرتا ہے کوئی بے سروپا پیٹ کے لئے
جو ہے سو ہو رہا ہے فدا پیٹ کے لئے

عاجز ہیں اس کے واسطے کیا شاہ کیا وزیر
محتاج ہیں اِسی کے لئے بخشی و وزیر
منشی وکیل ایلچی متصدی و مشیر
چاکر نفر غلام تونگر غنی فقیر
سب کر رہے ہیں فکر سدا پیٹ کے لئے

بیٹھے ہیں مسجدوں میں مصلے بچھا بچھا
جبے پہن کے ہاتھ کو تسبیح کو پھرا
واعظ کے ہر سخن میں ہے کھانے کا مدعا
عابد بھی دعوتوں کی عبادت ہے کر رہا
زاہد بھی مانگتا ہے دعا پیٹ کے لئے

نٹ کھٹ اُچکے چور دغاباز راہ مار
عیار جیب کترے نظر باز ہوشیار
سب اپنے اپنے پیٹ کے کرتے ہیں کاروبار
کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں شکار
بلی بھی مارتی ہے چُہا پیٹ کے لئے

فاضل کے فضل میں بھی اِسی کی ہے التجا
عابد نجومی کا بھی اِسی پر ہے مدعا
ملا بھی دن گزارے ہے لڑکے پڑھا پڑھا
شاعر بھی دیکھئے تو قصیدے بنا بنا
کیا کیا کرے ہے وصف وثنا پیٹ کے لئے

الفت کسی کے دل میں کسی کے پڑا ہے بیر
مانے کوئی حرم کو کوئی پوجتا ہے دیر
کھانے کی ساری دوستی کھانے کی ساری سیر
کہتا ہے اب فقیر بھی دے کر دعائے خیر
بابا کچھ آج مجھ کو دلا پیٹ کے لئے

ہیں جن کے پاس منصب وجاگیر و مال وجاہ
خوباں بھی اُن کے ساتھ کریں ہیں سدا نباہ
کھانے کی ساری دوستی کھانے کی ساری چاہ
دیکھا جو خوب غور سے ہم نے تو واہ واہ
معشوق بھی کریں ہیں وفا پیٹ کے لئے

لاکھوں میں کوئی لے ہے محبت سے حق کا نام
ورنہ سب اپنے پیٹ کے ہیں کلمے اور کلام
نہ عاقبت کی فکر نہ راہِ خدا سے کام
سمجھے نہ کچھ حلال نہ جانا کہ کچھ حرام
جو جس سے ہو سکا سو کیا پیٹ کے لئے

مفلسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اُس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

کہئے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں
تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں
مفلس ہوئے تو حضرتِ لقمان کیا ہیں یاں
عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈوباتی ہے مفلسی

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اُسے بے بتاتے ہیں
وہ جو غریب غرباً کے بچے پڑھاتے ہیں
اُن کی عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مفلس کرے جو آن کے مجلس کے بیچ حال
سب جانیں روٹیوں کا یہ ڈالا ہے اُس نے جال
گر گر پڑے تو کوئی نہ لیوے اُسے سنبھال
مفلس میں ہوویں لاکھ اگر علم اور کمال
سب خاک بیچ آکے ملاتی ہے مفلسی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر
جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

بی بی کے نتھ نہ لڑکوں کے ہاتھوں کڑے رہے
کپڑے میاں کے بنئے کے گھر میں پڑے رہے
جب کڑیاں بک گئیں تو کھنڈر کیا اڑے رہے
زنجیر نہ کواڑ نہ پتھر گڑے رہے
آخر کو اینٹ اینٹ کھداتی ہے مفلسی

جب مفلسی سے ہووے کلاونت کا دل اداس
پھرتا ہے لے طنبورے کو ہر گھر کے آس پاس
اک پاؤ سیر آٹے کی دل میں لگا کے آس
گوری کا وقت ہووے تو گاتا ہے وہ بھباس
یاں تک حواس اُس کے اُڑاتی ہے مفلسی

مفلس جو بیاہ بیٹی کا کرتا ہے بول بول
پیسہ کہاں جو جا کے وہ لادے جہیز مول
جورو کا وہ گلا ہے کہ ہو جیسے پھوٹے ڈھول
گھر کی حلال خوری تلک کرتی ہے ٹھٹھول
ہیبت تمام اُس کی اٹھاتی ہے مفلسی

مفلس کا درد دل میں کوئی ٹھانتا نہیں
مفلس کی بات کو بھی کوئی مانتا نہیں
ذات اور حسب نسب کو کوئی جانتا نہیں
صورت بھی اُس کی پھر کوئی پہچانتا نہیں
یاں تک نظر سے اُس کو گراتی ہے مفلسی

چولہے توا نہ پانی کے مٹکے میں آبی ہے
پینے کو کچھ نہ کھانے کو اور نے رکابی ہے
مفلس کے ساتھ سب کے تئیں بے حجابی ہے
مفلس کی جورو سچ ہے کہ ہاں سب کی بھابھی ہے
عزت سب اُس کے دل کی گنواتی ہے مفلسی

مفلس کسی کا لڑکا جو لے پیار سے اُٹھا
باپ اُس کا دیکھے ہاتھ کا اور پاؤں کا کڑا
کہتا ہے کوئی جوتی نی لیوے کہیں چُرا
نٹ کھٹ اچکا چور دغاباز گٹھ کٹا
سو سو طرح کے عیب لگاتی ہے مفلسی

اہلِ دنیا

کیا کیا فریب کہئے دنیا کی فطرتوں کا
مکر و دغا و دزدی ہے کام اکثروں کا
جب دوست مل کے لوٹیں اسباب مشفقوں کا
پھر کس زباں سے شکوہ اب کیجے دشمنوں کا
ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

گر دن کو ہے اچکا تو چور رات میں ہے
نٹ کھٹ کی کچھ نہ پوچھو ہر بات بات میں ہے
اُس کی بغل میں گپتی اور تیغ ہاتھ میں ہے
وہ اُس کی فکر میں ہے یہ اس کی گھات میں ہے

ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

نادان کو پلا کر اک بھنگ کا پیالا
کپڑے بغل میں مارے اور لے لیا دوشالا
دانا ملا تو اُس میں گھولا دھتورا کالا
ہوتے ہی غافل اُس کو پھانسی مین کھینچ ڈالا
ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

چڑیا نے دیکھ غافل کپڑا ادھر گھسیٹا
کوے نے وقت پا کر چڑیا کا گھر گھسیٹا
چیلوں نے مار پنجے کوے کا سر گھسیٹا
جو جس کے ہاتھ آیا وہ اُس نے دھر گھسیٹا
ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

برسات اور پھسلن

برسات کا جہان میں لشکر پھسل پڑا
بادل بھی ہر طرف سے ہوا پر پھسل پڑا
جھڑیوں کا مینہ بھی آ کر سراسر پھسل پڑا
چھتا کسی کا شور مچا کر پھسل پڑا
کوٹھا جھکا اٹاری گری زر پھسل پڑا

جھڑیوں نے اس طرح کا دیا آ کے جھڑ لگا
سنئے جدھر ادھر کو جھڑاکے کی ہے صدا
کوئی پکارے ہے مرا دروازہ گر چلا
کوئی کہے کہ ہائے کہوں تم سے اب میں کیا

تم در کو جھینکتے ہو مرا گھر پھسل پڑا

باراں جب آ کے پختہ مکاں کے تئیں ہلائے
کچا مکاں پھر اُس کی بھلا کیونکہ تاب لائے
ہر جھونپڑے میں شور ہے ہر گھر میں ہائے ہائے
کہتے ہیں یارو دوڑیو جلدی سے ہائے ہائے
پاکھے پچھیت سو گئے چھپر پھسل پڑا

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا
کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا
اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ بچا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آ کر پھسل گیا

کیچڑ سے ہر مکاں کی تو بچتا بہت پھرا
پر جب دکھائی دی گھنے بالوں کی اک گھٹا
بجلی بھی چمکی حُسن کی مینہہ برسا ناز کا
پھسلن جب ایسی آئی تو پھر بس نہ کچھ چلا
آخر کو واں نظیر بھی آ کر پھسل پڑا

ہولی

آدھمکے عیش وطرب کیا کیا جب حسن دکھایا ہولی نے
ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خورسند کیا ہر دل کو لبھایا ہولی نے
دف رنگیں نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے
بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے

سب ابرن تن پر جھمک رہا اور کیسر کا ماتھے ٹیکا
ہنس دینا ہردم نازبھرا دکھلانا سج دھج شوخی کا
ہر گالی، مصری، قندبھری، ہر ایک قدم اٹکھیلی کا
یا سوانگ کہوں یا رنگ کہوں یا حسن بتاؤں ہولی کا
دل شاد کیا اور موہ لیا یہ، جو بن پایا ہولی نے

کچھ طبلے کھٹکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی
کچھ جھڑپیں بین ربابوں کی کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے، کچھ ڈھمڈھی اور منہ چنگ بجی
کچھ گھنگرو کھٹکے جھم جھم جھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

ہر جاگہ تھال گلالوں سے، خوش رنگت کی گل کاری ہے
اور ڈھیر ابیروں کے لاگے، سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے
منہ سرخی سے گل نار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ہولی نے

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گل گوں، کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودے ہیں، کچھ اچھلے ہیں، کچھ ہنستے ہیں، کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشا عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

بنجارہ نامہ

ٹک حرص وہوس کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
کیا بدھیا، بھینسا بیل شتر، کیا گونیں پلا، سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر، کیا آگ دھواں اور انگارہ
سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری، کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا ڈھاک منقہ سونٹھ مرچ، کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

یہ بدھیا لادے بیل بھرے جب پورب پچھم جاوے گا
یہ سود بڑھا کے لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا کچھ کنبہ کام نہ آوے گا

سب ٹھاٹھ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

ہر منزل میں اب ساتھ ترے، یہ جانا ڈیرہ، ڈانڈا ہے
زر، دام، درم کا بھانڈا ہے، بندوق، سپر اور کھانڈا ہے
جب نائیک تن کا نکل گیا، جو ملکوں ملکوں بانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نا بھانڈا ہے، نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے

سب ٹھاٹ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

جب چلتے چلتے رستیمیں یہ جون تیری ڈھل جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے، سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھن پوت، جمائی بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی

سب ٹھاٹ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے، یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی، پل ساعت میں، یہ کھیپ بدن کی ہے کھپنی
کیا تھال کٹورے چاندی کے، کیا پیتل کی ڈبیا ڈھپنی
کیا برتن سونے روپے کے، کیا مٹی کی ہنڈیا ڈھپنی

سب ٹھاٹ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

کچھ کام نہ آوے گا تیرے، یہ لال زمرد سیم و زر
جب پونجی باٹ میں بکھرے گی، پھر آن بنے گی جان اوپر
نقارے نوبت، بان، نشان، دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکان، کیا چوکی کرسی تخت چکر

سب ٹھاٹ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے، ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرہ آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور، کیا گوٹے تھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لال عماری کے

سب ٹھاٹ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

مغرور نہ ہو تلواروں پر، مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے، منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبّی موتی ہیروں کی، کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بکچے تاش مُشجر کے، کیا تخت شال دو شالوں کے

سب ٹھاٹ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

کیا سخت مکان بنواتا ہے، خم تیرے بدن کا ہے پولا
تو اونچے کوت اٹھاتا ہے، واں دیکھ گور گڑھے نے منہ کھولا
کیا ریتی، خندق، رن بھرے، کیا برج، کنگورہ انمولا
گڑھ، کوٹ، رہاکا توپ قلعہ، کیا شیشہ دارو اور گولا

سب ٹھاٹ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

ہر آن نفع اور ٹوٹے مین کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل میں سوچ زرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی، دائی دوا، کیا بندہ چیلا نیک چلن
کیا مندر مسجد تال کنواں، کیا گھاٹ سرا کیا باغ چمن

سب ٹھاٹ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا
کوئی ناز سمیٹے گا تیرے کوئی گون سیئے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں، تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک بھنگا آن نہ جھانکے گا

سب ٹھاٹ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

بیوی اور بستر

مشہور شاعر محسن احسان علیل تھے۔ احمد فرازؔ عیادت کے لئے گئے۔ دیکھا کہ محسنؔ احسان کے بستر پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ چادر بھی میلی تھی۔ احمد فرازؔ نے صورت حال دیکھ کر مسکراتے ہوئے محسنؔ سے کہا۔۔۔ ”یار اگر بیوی بدل نہیں سکتے تو کم از کم بستر ہی بدل دو“

عجیج بھائی

کھیال یہ جو ہمارے دل میں ہے آج آیا عجیج بھائی
اِسے ہماری ارج سمجھ لو یا اپنا دکھڑا عجیج بھائی

تمہیں کھبر یہ ملی تو ہو گی کسی نے تم سے کہا تو ہو گا
گلی میں کیا گل کھلا رہا ہے ہمارا لمڈا عجیج بھائی

کسی سے ہم کیا کریں سکایت کھراب نکلی ہماری کسمت
ہے ایک انڈہ سو وہ بھی گندہ عجب تماسا عجیج بھائی

نہ کام کا ہے نہ کاج کا ہے، پھکت وہ دشمن اناج کا ہے
مگر وہ آکھر کو ہے تو اپنا جگر کا ٹکڑا عجیج بھائی

نہ گُر ہی سیکھا چلت پھرت کا، نہ کام سیکھا ہے کوئی گت کا
دکان داری کرادیں اِس کو یہی ہے سونچا عجیج بھائی

مگر کہاں سے اب آئے نقدی، تمہیں کھبر ہے ہمارے گھر کی
اِسی پھکر میں تو سر ہمارا ہوا ہے گنجا عجیج بھائی

یہ سونچتے ہیں کہ بیاہ کر دیں، کسی سے اِس کا نکاح کر دیں
پڑے گی سر پہ تو کام دھندے سے کھد لگے گا عجیج بھائی

کھُدا نے دی ہے تمہیں جو بیٹی، پھکر لگی ہے ہمیں بھی اِس کی
گھُسی گلی میں ہے اِک جمانے سے اپنا ساجھا عجیج بھائی

نہیں ہے اچھا جوان لڑکی کو گھر میں ایسے بٹھا کے رکھنا
نکل نہ جائے تمہاری عجت کا ہی جناجا عجیج بھائی

یہ جان حاجر تمہاری کھاطر، ہمارا بیٹا تمہارا بیٹا
وکھت پہ آویں نہ کام اپنے؟ گجب کھدا کا عجیج بھائی

ہمارے بیٹے سے اپنی بٹیا کا بیاہ کر دو، ہماری مانو!
ہرج سے بھارگ ہو جتنی جلدی، ہے اُتنا اچھا عجیج بھائی

نہ گم کرو کہ ہمارے بیٹے کے نام ہو گا تمہارا سب کچھ
جو آنی جانی ہے چیج اُس پر گلت ہے رونا عجیج بھائی

جرا بھی سودا نہیں ہے مہنگا، اگر یہ سوچو کہ اس کے بدلے
ملے گا سمدھی تمہیں سیانا، تمہارے جیسا عجیج بھائی

شوکت جمال

حج کرنا ہے مشکل

ایک دن اِک مولوی صاحب ملے
باتوں باتوں میں وہ یہ کہنے لگے
چاہتا ہے ہر کوئی وہ حج کرے
تین لیڈر کر نہیں سکتے ہیں یہ
نام لیتا ہوں میں تینوں کا سنو
اِن کا حج کرنا ہے مشکل دیکھ لو!

سلسلہ یہ صرف دیں‌داری کا ہے
کام اس کا کب ریا کاری کا ہے
اِک عمل شیطاں کی سنگساری کا ہے
''زور داروں'' لی گگوں ساری کا ہے
کون پتھر مارے اپنے آپ کو
اِن کا حج کرنا ہے مشکل دیکھ لو!

دوسرے ہیں اِن میں ''ٹیلیفون بھائی''
جن تقریریں ہیں اِن کی کُل کمائی
ہے سخن ہی جن کا مانندِ دوائی
یہ حقیقت ہے، نہیں ہے یہ ہوائی
فون پر ہوتا نہیں ہے حج سنو
اِن کا حج کرنا ہے مشکل دیکھ لو!

تیسرے صاحب ہیں سب سے ہی شریف
یوں بناتے ہیں وہ دشمن کو حلیف
یا ''نوازا'' یا کیا اندر حریف
کہہ رہا تھا اُن کی بابت اِک ظریف
دل کہاں مانے کا اُن کا ٹنڈ کو
اِن کا حج کرنا ہے مشکل دیکھ لو!

روئے نرگس اپنی بے نوری پہ ہائے
دیدہ ور پیدا بمشکل ہونے پائے
پھر ''ہنر سرجن'' کی محنت رنگ لائے
لاکھوں کر کے خرچ جو زلفیں اُگائے
بال منڈوائے گا کیسے وہ کہو
اِن کا حج کرنا ہے مشکل دیکھ لو!

سید مظہر عباس رضوی

اگر لکھ پڑھ بھی لیتا میں

اگر لکھ پڑھ بھی لیتا میں
قیامت کون سی آتی
بڑا بھائی تھا اماں جان کی آنکھوں کا تارا سا
مری تھی شومیٔ قسمت، میں تھا قسمت کا مارا سا

اگر لکھ پڑھ بھی لیتا میں
قیامت کون سی آتی
مرے ہاتھوں سے بنتے کام تھے سارے بگڑ جاتے
وہ خوش اقبال سے جو تھے قدم دھرتی میں گڑ جاتے

اگر لکھ پڑھ بھی لیتا میں
قیامت کون سی آتی
بڑے بابو کی جھڑکی سے چھڑا لیتا میں جاں کیسے
جہاں بختوں میں ناں لکھی، وہاں کرتا میں ہاں کیسے

اگر لکھ پڑھ بھی لیتا میں
قیامت کون سی آتی
جمیلہ کو علی کا بن کے ہی رہنا پڑا آخر
اُسے دیکھا کیا تھا بس کھڑا کا میں کھڑا آخر

اگر لکھ پڑھ بھی لیتا میں
قیامت کون سی آتی
میں اظہر تھا، مجھے دنیا میں اظہر بن کے رہنا تھا
لڑو تو پاؤ تم بس ہار بختوں سے یہ کہنا تھا

ارزم اظہر

ملکی مفاد میں

جو چاہے آپ کیجیے ملکی مفاد میں
قانون توڑ دیجیے ملکی مفاد میں

شاید اسی طرح سے ہو غربت کا خاتمہ
مہنگائی اور کیجیے ملکی مفاد میں

ردِ عمل ہو سخت تو مت کیجیے وہ کام
شوشہ ہی پہلے چھوڑیے ملکی مفاد میں

ملکی مفاد میں ہو ضروری نہیں مگر
کوئی بیان داغیے ملکی مفاد میں

پانی یہاں کا پی کے نہ معدہ خراب ہو
آب فرانس پیجیے ملکی مفاد میں

نایاب جانور ہیں مگر آپ آپ ہیں
جم جم شکار کھیلیے ملکی مفاد میں

خبریں یہاں کی جھوٹ پہ مبنی ہیں سب کی سب
چینل وہاں کا دیکھیے ملکی مفاد میں

جس مل سے ملک وقوم کے ہیں فائدے ہزار
مٹی کے مول بیچیے ملکی مفاد میں

یہ قوم سچ کو جھوٹ سمجھتی ہے آج کل
کچھ بھی ہو سچ نہ بولیے ملکی مفاد میں

روشن خیال کون ہے اسلام سے سوا
دنیا کو مت بتائیے ملکی مفاد میں

اک بار مل گئی ہے تو بس آپ کی ہے یہ
کرسی کبھی نہ چھوڑیے ملکی مفاد میں

کب تک مفادِ غیر کا کرتے رہیں دفاع
پالیسی اب بنائیے ملکی مفاد میں

ملکی مفاد میں ہے مری نظم یہ فصیح
مجھ پر نہ ہاتھ ڈالیے ملکی مفاد میں

شاہین فصیح ربانی

عزیزہ نے کہا تھا

عزیزہ سے کہا تھا
عزیزہ سے کہا تھا
ناشتے میں سادگی رکھنا

ڈبل روٹی ہو، چائے ہو
چلو چھولے بھی ہوں بے شک

عزیزہ سے کہا تھا
ناشتے میں سادگی رکھنا

مگر، جب ناشتہ آیا
تو نظروں نے نظارہ ہی عجب دیکھا
اِدھر اک سمت چھولے تھے
اُدھر سالن مٹن کا تھا
بہار افروز تھے جس میں، مرے من بھاونے ٹینڈے
کڑاہی تھی چکن کی رونق افزا
ایک ڈونگے میں
دہی کی پھلکیاں کہتے ہیں جن کو لوگ
وہ بھی تھیں
پراٹھے تھے فراوانی سے
خاصی روٹیاں بھی تھیں
بذاتِ خود، دہی بھی تھا الگ سے ایک برتن میں
نظر کو خیرہ کرتی تھی پڑی اک پرچ میں چینی
رکھے تھے ایک جانب، پیاز کے ترشے ہوئے قتلے
نہایت ذائقے دار
اُس طرف لوکی کا حلوہ تھا

عزیزہ سے کہا تھا
ناشتے میں سادگی رکھنا

کبھی کی اپنے
بے قدری
کبھی اتنی نہ بھائی تھی
شکایت تھی لبوں پر
اور خوشی دل میں سمائی تھی

دکھائے ہاتھ وہ میں نے
کہ دسترخوان کی
ہر شے کے ہونٹوں پر دہائی تھی
معاذ۔۔انگشت دانتوں میں دبائے
محوِ حیرت تھا
عمر۔۔کے رخ پہ بھی
واضح تھیں استعجاب کی لہریں
عقیل۔۔۔البتہ ٹھہرا کامراں
اس مرحلے پر بھی
کہ اس نے اپنے چہرے پر
تاثر ہی نہیں آنے دیا
کوئی
سوائے خوش گواری کے

کچن میں ساری چیزوں کی گئی مقدار جو بچ کر
حقیقت میں
وہ میری خوش خوراکی کی
بڑی بیّن شہادت تھی

عزیزہ سے کہا تھا
ناشتے میں سادگی رکھنا

سید نعیم الدین ضیاء

دسمبر کے نام

حکومت نے نیا فرمان جاری کر دیا ہے
سبھی شاعر
نہایت ہی توجہ سے اسے پڑھ لیں
(کسی نوخیز محبوبہ کی پہلی ڈاک کی مانند)
فقط یہ حکم نامہ ہی نہیں
سنگین سی اک وارننگ بھی ہے
(یہ منکوحہ کی اک گستاخ سی گڈ مارننگ بھی ہے)
نئے فرمان میں لکھا ہوا ہے
دسمبر کے حوالے سے
کوئی ننھی سی بھی مصرع تراشی اب
خلافِ ضابطہ ہوگی
(چول پن کی یقینی انتہا ہوگی)
کڑی اس کی سزا ہوگی
اور اس کے مرتکب کو یوں کھلے بندوں
حسیناؤں سے
جبری وصل کی دھمکی نما ڈیمانڈ کرنے کی جسارت پر
(کسی دل پھینک جیری کی
کسی بھی ٹام سے دو پل کی جذباتی شرارت پر)
دسمبر کے گزرنے تک
وصالِ غیر آئینی کے نشے کے اترنے تک
پکڑ لے گی مقامی پلس فوراً
دسمبر یافتہ ایسے سخنور کا
بنایا جائے گا مسکن
کسی تھانے میں تہہ خانے کے اندر
اسے شعر و ادب کے طفلِ مکتب بھی کہیں گے
حماقت کا بھکاری اور عبرت کا سکندر
(نہایت بے سبب سنگھار جیسا
مری آنکھوں نے دیکھا خواب کیسا؟)

ڈاکٹر فیصل عزیز

ایک فورم کا یارو سنو ماجرا
چار لڑکے چلاتے تھے مل کر جسے
جس پہ شاعر کوئی آتا جاتا نہ تھا
وہ کسی شعرپرور کو بھاتا نہ تھا
سب سخندان رہتے تھے اس سے پرے
دور دورہ اداسی کا تھا جا بجا
شاعری ، نثر ، فوٹو بہت تھے مگر
ہو کا عالم ہی رہتا تھا دن بھر وہاں
چاروں لڑکے بہت ہی پریشان تھے
ایک دن ایک تدبیر سوچی گئی
چار میں تین کی جنس بدلی گئی
ایڈمنز اب وہاں ایک لڑکا ہے اور
تین ہیں لڑکیاں
گہما گہمی ہے اب خوب احباب کی
اب سخن ور بھی ہیں اور نقاد بھی
نکتہ دانی بھی ہے اور تحسین بھی
شعر فہمی بھی ہے، شعر گوئی بھی ہے
خوب بحثیں ہیں اور تذکرے خوب ہیں
اہلِ فن اور مجدد وہاں پر ملیں
سب سخن کے مجاہد وہاں پر ملیں
شاعری وزن میں ہو کہ بے وزن ہوں
آج کل اس جگہ واہ وا خوب ہے

سید افتخار حیدر

خارش

کیا مرض کا پوچھتے ہو حال خارش ہو گئی
ڈاکٹر نے بھی اتاری کھال خارش ہو گئی

ڈاکٹر سے لے کے آئے تھے جو خارش کی دوا
چند منٹ میں اُڑ گئے ہیں بال خارش ہو گئی

جب دکھائے نوٹ تو اچھے بھلے دیکھے گئے
خرچ کرنا پڑ گیا جو مال خارش ہو گئی

ماتحت نے شوق سے دعوت میں آنے کو کہا
اور جب اس نے کھلائی دال خارش ہو گئی

کل فقیرانہ صدا دے کر بھکاری نے کہا
نوٹ دے دے بھیک میں تو لال خارش ہو گئی

آئے تھے آرڈر پہ لیکن سارے جھاویں بک گئے
پڑ گیا ہے شہر بھر میں کال خارش ہو گئی

پہلے پہلے تو چلا محفل مین بھی ڈسکو کا دور
جب کلاسیکی مچا سُر تال خارش ہو گئی

حشر میں کرتے رہے حوروں کا واعظ تذکرہ
اور جب پوچھے گئے اعمال خارش ہو گئی

سید فہیم الدین

شرارتی لکیریں

Presented By: https://jafrilibrary.com

ڈاکہ اپنی جگہ خیرات اپنی جگہ

ادبی کُتب کی افادیت سے کسی کو بھی انکار نہیں

سگریٹ نوشی صحت کے لئے مضر ہے

قطعات

بے رُخی

بہت بوجھل ہے میری زندگی بتلاؤں اب کیسے؟
ہے گرمی، گھر میں اے سی کی کمی محسوس ہوتی ہے

بالآخر اے سی لے آیا تو اب بجلی نہیں آتی
مجھے یہ واپڈا کی بے رُخی محسوس ہوتی ہے

محمد عاطف مرزا
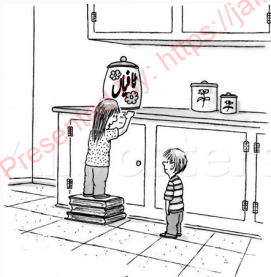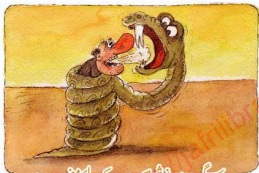
سمندری طوفان، نیلوفر کے نام

کہنا ہے مٹرولوجی کے ہر افسر کا
ایک سمندر ہوش حواس بھی کھو سکتا ہے

" نیلو فر " کا یہ طوفان گزر جانے دو
اگلا نام "بشیراں " کا بھی ہو سکتا ہے

ڈاکٹر عزیز فیصل

حُسنِ ظن/ زن

وہ ڈھونڈ لے گا بہت جلد جان من کوئی اور
غلط کہ پاس نہیں اس کے آپشن کوئی اور

کوئی تو جا کے بتائے یہ بات کاتب کو
کہ حسن زن ہے کوئی اور حسن ظن کوئی اور

ڈاکٹر عزیز فیصل

نعرہ

جانِ جاناں سے رہوں میں چند فٹ بھی دور کیوں؟
میرے گردے فیل کر سکتا ہے یہ جور و ستم

" گو فلانا گو" کے نعرے سن کے بھی فیصل عزیز
دل مرا کہتا ہے رو کر " کم بشیراں بی بی کم "

ڈاکٹر عزیز فیصل

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

راز کی بات

کچھ کہتے ہیں میں نے داڑھی رکھ لی ہے
کچھ کہتے ہیں شیو بڑھائے پھرتا ہوں

لیکن راز کی بات کو راز ہی رہنے دو
میں چہرے کے ڈینٹ چھپائے پھرتا ہوں

زباں بندی

بولا شوہر سب بڑے رائٹر یہ لکھتے آئے ہیں
اُن کو گھر میں بولنے کا حق دیا جائے کبھی

بیوی بولی یہ بڑے رائٹر بھی سب لاچار تھے
وہ بھی سارے لکھ ہی پائے بول نہ پائے

MISUSE

اِن پر بھی عورتیں ہی مسلط ہیں ان دنوں
پہلو ہیں جس قدر بھی مذاقِ سلیم کے

حتیٰ کہ لازمی ہیں یہ ان میں بھی آج کل
بنتے ہیں اشتہار جو شیونگ کریم کے

خوش لباسی

رنگ برنگی شرٹیں اور ٹی شرٹیں میری دیکھ کر
مجھ سے وہ کہنے لگی کہ تم ہو کتنے خوش لباس

ہو رہا تھا دل ہی دل میں خوش میں اس تعریف پر
ہنس کے وہ بولی کہ لنڈا آ گیا ہے تم کو راس

حاضر جواب بیوی

بیوی بولی پرس دیں اب عید سر پر آ گئی
بولا شوہر کیا گرانی کا تمھیں احساس ہے

پرس کی جا تم کو اب کچھ عقل دینی چاہیے
بولی وہ مانگا ہے میں نے جو تمہارے پاس ہے

محنتی خواتین

سچ ہے عورت مرد سے بڑھ کر محنت کرتی ہے
کون ہے جو انکار کرے گا اس کی عظمت سے

چھ چھ گھنٹے محنت کرتی ہیں یہ میک اپ پر
اتنی پیاری لگتی ہیں یہ اتنی محنت سے

باپ کا آزمودہ مشورہ

بیٹا بولا باپ سے شادی نہیں کرنی مجھے
میں تو ڈر جاتا ہوں ان سب لڑکیوں کو دیکھ کر

باپ بولا سب سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں
تم کو بس رہنا پڑے گا لگ کے نیچے اک کے

میاں بیوی کی نوک جھوک

بھوکا شوہر بولا بیگم کھانا دو جلدی
خالی پیٹ میں چوہے دوڑتے پھرتے ہیں ہر جا

بیوی بولی کھانا پکنے میں ہے کافی دیر
فی الحال آپ کو دے دیتی ہوں چوہے مار دوا

دخترِ تھانیدار

بڑے چاؤ سے تھانیدار کی بیٹی سے کی شادی
یہی بس ہوگئی سب سے بڑی اِک ہم سے نادانی

امورِ خانہ داری تو اِسے چھو کر نہیں گزرے
رموزِ تھانہ داری میں نہیں اِس کا کوئی ثانی

لاشعوری غلطی

لاشعوری طور پر بھی غلطیاں ہوتی ہیں کچھ
وقت ایسا آ ہی جاتا ہے کبھی انسان پر

دیکھ کر پینٹر کی غلطی لوگ تھے ناراض سب
اس نے ویلکم لکھ دیا تھا بابِ قبرستان پر

باپ کی وصیت پر عمل

باپ بولا شادی مت کرنا اذیت ہے نری
باندھ لے پلو سے یہ میری وصیت لازمی

بیٹا بولا میں رکھوں گا یہ گرہ میں باندھ کر
اپنے بچوں کو کروں گا یہ نصیحت لازمی

حکم کا غلام

کہا مالک نے تم بازار میں گھنٹے لگاتے ہو
مرا یہ حکم تھا ہر کام کو منٹوں میں نمٹانا

کہا نوکر نے سر جی آپ کا ہی حکم ہے یہ بھی
اگر بازار میں جاؤ تو بجلی کی طرح آنا

چاردن کی چاندنی

جی رہا ہوں آج کل میکے سے میں
اب مین خود اپنا وزیرِ مال ہوں

اِن دنوں بیوی مری میکے میں ہے
اِن دنوں میں گھر میں آل اِن آل ہوں

بیوی کی دعا

میرے مولا میرے شوہر کو خزانے بخش دے
اس کو مالا مال کر دینا ترے ہاتھوں میں ہے

اپنی اس دنیا کی ہر نعمت اسے کر دے عطا
اس سے پھر ہر چیز لے لینا مرے ہاتھوں میں ہے

POOR COOKING

کہا بیوی نے اپنے دوسرے شوہر سے یہ جل کر
خدا بخشے وہ کھا جاتے تھے جو میں دوں چپاتی سے

کہا شوہر نے یہ ایسے ہی کھانوں کا نتیجہ ہے
جوانی ہی میں جو منہ موڑ بیٹھے وہ حیاتی سے

خوش فہمی

حسینوں سے کہیں بڑھ کر حسین اُس کے تئیں ہوں میں
مجھے کہنے لگا کہ ماہ رُخ و مہ جبیں ہوں میں

مجھے معلوم ہی نہ تھا میں اتنی خوبصورت ہوں
مجھے کل ایک حافظ نے بتایا ہے حسیں ہوں میں

رائے

میں نے پوچھا مولوی صاحب سے رائے میں مجھے
حلوۂ بادام ہے یا حلوۂ پستہ لذیذ

مولوی صاحب یہ بولے رائے میں دوں گا تبھی
جب ہوں حلوؤں کی پراتیں سامنے میرے عزیز

اچھی بیوی کے خواص

جب اچھی اہلیہ کے خواص پڑھتا ہوں رسائل میں
لگا لیتا ہوں اس کو کاٹ کر میں اپنی فائل میں

بچا لیتی ہے شوہر کو وہ دنیا کے بکھیڑوں سے
مگر الجھا کے رکھتی ہے اسے اپنے مسائل میں

طارق کی دُعا (پاکستان پہنچ کر)

(روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

یہ لیڈر یہ تیرے پُر اسرار بندے
سمٹ کر عوام اِن کی ہیبت سے رائی
سیاست سے کرتی ہے بے گانہ دِل کو
عجب ہے یہ اِن لیڈروں کی خدائی
پہنچ اِن کی امریکہ برطانیہ تک
پریشان کرتی ہے اِن کی رسائی
کہ شہرت ہے مطلوب و مقصودِ لیڈر
نہ دولت نہ کچھ ایسی ویسی کمائی
مکانوں میں ہیں منتظر لوگ کب سے
نہ بجلی نہ پانی نہ کھانے کو جب سے
کیا اِن کو جھگی نشینوں نے یکتا
بلیٹن میں، بینر پہ اور ہر خبر میں
وہ لالچ جو ابلیس نے کی تھی پیدا
وہی ہم نے پائی اُنھی کے جگر میں
کھلونا سمجھتے ہیں وہ عامیوں کو
"ہلاکت نہیں موت اِن کی نظر میں"
"دِلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرہ' لاتذر میں"
ہمیں لیڈروں سے تو بیزار کر دے
سمجھدار لوگوں کو بیدار کر دے

محمد خلیل الرحمن

ایک گنوار اور سپاہی

کوئی گنوار یہ کہتا تھا اِک سپاہی سے
تجھے ہو شرم تو یوں نہ اکڑ کے بات کرے
ذرا سا عہدہ ہے اِس پر غرور، کیا کہنا
یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور، کیا کہنا
خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھا
تو کیا سمجھ کے مجھے بدتمیز بن بیٹھا
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے
تجھ ایسے باندھ کے رکھتا ہوں تھان کے آگے
جو بات مجھ میں ہے تجھ کو بھلا نصیب کہاں
میں چوہدری کہاں، تو عام سا غریب کہاں
کہا یہ سن کے سپاہی نے منہ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے اِنھیں نکال ذرا
میں چوہدری نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے تو بھی تو مجھ جیسا بادشاہ بندہ
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
جو میں پلس میں ہوں تو یہ بھی اُس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اُس نے
مجھے بھی تجھ سے نمٹنا سکھا دیا اُس نے
قدم اُٹھانے کی ہمت نہیں ذرا تجھ میں
جو میں نہ چاہوں تو جرات نہیں ذرا تجھ میں
یوں اپنی مونچھ کے کنڈل سے نہ ڈرا مجھ کو
اِس اپنے چھکڑے کا لیسنس تو دکھا مجھ کو
اگر نہیں ہے تو کر چھیتی مک مکانے میں
کوئی بڑا نہیں رہتا ہے ورنہ تھانے میں

نوید ظفر کیانی

لکھنے والے